خدا کی معرفت

از افادات

تالیف:
مولانا علی نقی النقوی

مطبوعہ سرفراز قومی پریس
وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

فہرست مضامین

فہرست مضامین

امامیہ مشن لکھنؤ کی تریسٹھویں دینی خدمت

مدرست الواعظین لکھنؤ میں جناب سید العلماء مدظلہ کے مسلسل دس روز تک جو بیانات ہر سال ہوتے ہیں ۔اس سال1357 ھ میں بھی محرم کے آخری تاریخوں میں ہوئے ۔ان کے ان بیانات کا انتہائی اہم موضوع اول الدین معرفت کے عنوان سے معین ہوا تھا۔

ہمارے کرم فرما جناب سید محمد رضا صاحب نقوی سابق سکریٹری امامیہ مشن نےان مواعظ کو شارٹ ہینڈ سے بڑی جانفشانی کے ساتھ قلمبند فرمایا اور اب وہ کتابی صورت سے شائع کئے جارہے ہیں ۔

امید ہے کے افراد قوم اس مجموعے کی صحیح اہمیت کا احساس فرمائینگے اور ہماری اس خدمت کی عملی ہمت افزائی فرمائینگے ۔ والسلام۔

خادم ملت

ربیع الثانی1358ھ۔　　　　سید ابن حسین نقوی سکریٹری

امامیہ مشن۔ لکھنؤ

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِ الْعَالَمِينَ، وَالصَلَاةُ وَالسَلَامُ عَلَى سَيِدِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، عَلَى الْمُصْطَفَى خَاتَمِ النَبِيينَ وَآلِهِ الطَيِبِينَ الطَاهِرِينَ الْمَعْصُومِينَ، مِنْ يَوْمِنَا هَذَا إِلَى يَوْمِ الدِين"۔

تمہید

اول الدین معرفت

یہ میرا سرنامہ بیان ہے ۔اس کے معنی ہیں کے"دین کی پہلی منزل اس کی معرفت ہے"وہ کون؟یعنی خدا۔خدا سے کیا مراد ہے۔اس کی تفسیر وہی کرنا چاہیے جو معرفت حاصل ہونے کے قبل کی منزل قرار پاسکتی ہے۔کیونکہ معرفت تو وہ حکم ہے جو اس موضوع پر مرتب کیا جارہاہے۔ہمیں کہنا یہی ہےکے خدا کی معرفت حاصل کرو۔اس لیےخدا کا کوئی ایسا مفہوم بتانا چاہیے جو معرفت حاصل کرنے کے پہلے مخاطب کے سطحی ذہن میں آسکے۔اس کے تفصیلی ذات و صفات کا علم حاصل ہو جائے تووہ معرفت کی اصل منزل ہے۔جس تک پہنچنے کی ہم تحریک کررہے ہیں اس لیے وہ اس حکم میں موضوع میں داخل نہیں ہوسکتی۔

یہاں تو خدا کے مفہوم کی ایسی توضیح ہونا چاہیے جو نشان مقصد کی حیثیت سے ضروری ہے ۔یہ خدا کیا ہے جس کی معرفت حاصل کرنے کی طرف دعوت دی جارہی ہے ؟ ممکن ہے کہا جائے کے"خدا "سے مراد وہ شےہے جو کائنات کی مبداءاول ہے ۔اس طرح دائرہ میں اس کے تھوڑی تحدید ضرور پیدا ہوتی ہے مگر پھر بھی خدا کا یہ مفہوم نہیں ہے ۔اس لیے کے مادیین وطبیعین عالم کے لیے ایک

مبدا قرار دیتے ہیں اور وہ وہی ذرات مادہ ہیں یا طبیعت ۔مگر پھر بھی وہ خدا کے قائل نہیں مانے جاتے۔ اس سے معلوم ہوا کے خدا کا مفہوم کچھ اس کے علاوہ ہے ۔صرف مبداعالم کا اقرار کرلینا خدا کے وجود کا اقرار نہیں ہے ۔اس میں کچھ قید لگانے کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کے تمام کائنات کے لیے ایک ذی شعور خالق، اس کا ماننا خدا کا ماننا ہے یہی وہ چیز ہے جس کے تمام ارباب مذاہب قائل ہیں مادیین ،ہریین وطبیعیین جس کے منکر ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اہل مذاہب میں اس کے صفات میں اختلاف ہے ۔ یہی صفات کا حقیقی علم حاصل کرنا اس کی معرفت ہے۔

لیکن معرفت حاصل کرنے کے لیے ذہن کو متوجہ کرنے کے لیے اتنا ہی سمجھنا ضروری ہے ۔ "کائنات کا ذی شعور خالق"اسی کو خدا کہتے ہیں اس کا جو مصداق ہے اس کے ہر زبان میں مخصوص نام ہوگئے ہیں ۔جیسے عربی میں اللہ ۔فارسی سنسکرت اور انگریزی ہر زبان میں اسی طرح وہ نام جو اس سے مخصوص ہے۔

☆☆☆☆☆

خدا کی معرفت میں دشواری اور اس کے اسباب

وہ خدا جو کائنات کا ذی شعور خالق ہے جس کا نام ہے اللہ اور جس کے ہر زبان میں نام موجود ہیں اس کے حقیقی اوصاف کیا ہیں یہ معرفت کی منزل ہے ۔مگر یہ منزل انتہائی دشوار ہے ۔آپ تمام مذاہب عالم کو ایک جانب اور مادیین وغیرہ کی جماعت کوایک جانب قرار دیجئے تو آپ دیکھیں گے اکثریت خدا کو ماننے والوں ہی کی ہے۔ یعنی مذاہب کی تفریق سے قطع نظر کرکے۔ اسلام ہو یا

عیسائیت ۔مجوسیت ہو یا یہودیت یا ہندو دھرم ان تمام کے باہمی اختلافات سے علیحدہ ہوکراس نقطہ مشترک کے اعتبار سے جس پر یہ سب مجتمع ہیں یعنی ایک ایسی ہستی کو ماننا جو اس تمام کائنات کی خالق ہو ۔ملاحظہ فرمائیں تو یقیناً اس کے ماننے والوں کی تعداد بہ نسبت نہ ماننے والوں کے بہت زیادہ ہے ۔لیکن ان سب ماننے والوں کو دیکھا جاتا ہے کے یہ اوصاف الٰہی کے تعیین میں کسی ایک نقطہ پر مجتمع نہیں ہوتے ۔بلکہ جو فریق ہے وہ ایک خاص خیال رکھتا ہے ۔

حالانکہ جو ماننے والے ہیں وہ کہتے ہیں کے اس کا وجود انتہائی نمایاں ہے ۔ہر شخص کی زبان پر یہ آیا کرتا ہے کے عالم کا ہر ہر پتا اس کے وجود پر گواہ ہے اور دنیائے کائنات کا ہر ذرہ اس کا پتہ دیتا ہے لیکن پھر بھی اس کے پہچاننے میں عالم انسانیت میں اس قدر افتراق ہوا ہے کے دنیا کا کوئی مسئلہ محل اختلاف نہیں قرار پایا۔

اس کی کیا وجہ ہے ؟ خدا کی معرفت اتنی مشکل کیوں ہے؟اس کے بہت سے اسباب ہیں ۔

پہلا سبب

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ انسان جس چیز کو سمجھنا چاہتا ہے اس کا نمونہ اپنے سامنے رکھ لیتا ہے۔یعنی اگر آپ کسی چیز کا مجھ سے پوچھے کوئی پھول،کوئی کپڑا کوئی خاص کتاب اور کوئی چیز جو آپ نے نہ دیکھی ہواس کو سمجھنا چاہیے تو میں آپ کے سامنے اس کا نمونہ پیش کرونگا اور مثال دونگا آپ کو سمجھنے میں آسانی ہوگئی۔ فلاں پھول کیسا ہوتا ہے ؟میں کہونگا جیسا وہ پھول۔اسی سے ملتا جلتا ۔ اسی طرح ہر چیز کے لیے کوئی نمونہ ہے ۔اگر مکمل نمونہ نہ ملے گا تو اس کے مختلف صفات کے لیے مختلف

نمونے تلاش کرکے آپ کے سامنے پیش کرونگا ۔ مثلاً میں کہونگا کے رنگ فلاں چیز کا ہوتا ہے۔یوفلاں کی،ذائقہ فلاں چیز کا،شکل فلاں چیز کی ۔اسی طرح اگر مادہ چیز پورے طور پر آپ کے سامنے نہ آئی ۔مگر مثالوں نے ایک صورت اس کی آپ کے ذہن میں ضرور پیدا کردی ۔

لیکن اگر کوئی ہستی ایسی ہوکے اس کی مثال بالکل نظر سے گزری نہ ہو۔اس کا ہر پہلو بےمثال ہوتو اسے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کس طرح کی جائے ۔انسان جتنا غور کرتا ہے یہ سمجھ میں آتا ہے کے وہ جیسا ہے ویسا کچھ بھی نہیں ہے ۔اب میں اگر اس کو سمجھانے کی مثالوں کے ذریعے سے کوشش کروں تو جتنی مثالیں بڑھتی جائینگی ۔اتنا ہی اس کی منزل سے دور ہوتا جائونگا۔اس لیے کے وہ کمال مطلق ہے اور ادھر ہے نقص ۔

وہ غنی مطلق ہے اور ادھر ہے احتیاج۔وہ واجب الوجود ہے اور ادھر ہے امکان ۔بالکل یہ چیزیں اس سے الگ ہیں ۔اگر میں ان ناقص چیزوں کو ملائونگا تو نقصان کی تصویر مکمل ہوگی اور کمال اتنا ہی دور ہوجائے گا ۔یہ مثالوں کا دینا اس کی ذات سے اور بیگانہ بنائے گا نہ یہ کے اس کی شناسائی کا باعث ہو پھر آسانی سے اس کی معرفت کہاں حاصل ہوسکتی ہے ۔

☆☆☆☆☆

دوسرا سبب

انسان کی طبیعت کو جس بات سے لگاؤ ہوتا ہے اس بات سے طبی حیثیت سے مانوس ہوتا ہے ۔ اپنے شہر کے لوگ اپنے محلہ کے رہنے والے اپنے گھر کے افراد ان سے درجہ بدرجہ انس کیوں ہوتا

ہے۔اس لیے کے ان کے ماحول سے انھیں اتنا ہی زیادہ تعلق اور اجنبی اشخاص دوسرے ملک کے رہنے والوں سے آدمی کیوں گھبراتا ہے اس لیے کہ اس کو ان کے ساتھ مجانست نہیں ہے اور سابقہ نہیں رہا ہے ۔جو کام آپ ایک دفاع کر چکے ہیں اس کے لیے آپ سے کہا جائے تو آپ کو کوئی دشواری نہ محسوس ہوگی ۔اسی طرح اگر خود نہیں کیا ہے مگر دیکھا ہے ایسے لوگوں کو جنھوں نے اس مہم کوسر کیااس جگہ قدم کچھ رکے گا بھی تو پھر دوسرے لوگوں کا مشاہدہ آگے بڑھا دیگا اس لیے کہ طبیعت اس سے کسی حد تک مانوس ہوچکی ہے ۔

ایک مکان جہاں آپ برابر آتے جاتے رہے ہوں وہاں کچھ دیر تنہا بھی بیٹھنا پڑے تو وحشت نہیں ہوگی ۔مگر ایسے مکان میں جو بالکل اجنبی ہو تھوڑی دیر رہنے میں دل پریشان ہوگا ۔ اب آپ دیکھیے کے انسان خود مادی ہے ۔آنکھیں کھولتا ہے تو ہر طرف دیکھائی دیتا ہے مادہ آنکھیں بند کرتا ہے تو محسوس ہوتا ہے مادہ سنتا ہے تو مادی فضاکی آوازیں کانوں میں آتی ہیں ۔

قوت شائۂ سے کام لیتا ہے تو اسی مادی دنیا کی خوشبو اور بدبو کا احساس کرتاہے چھوتا ہے تو مادی اجسام ہاتھ سے متصل ہوتے ہیں ،غرض سوتے جاگتے ۔اٹھتے بیٹھتے آنکھ نہیں ۔کانوں میں ۔دماغ میں ۔دل میں ہر طرف یہی مادہ ہی مادہ ہے۔ مگر وہ ہستی جسے خدا کہا جاتا ہے وہ ہے جسے کبھی اس نے خواب میں بھی نہیں دیکھا۔کیونکہ خواب میں وہی چیز دکھائی دیتی ہے جو بیداری میں دیکھنے کے قابل ہو۔پھر اس عالم ممکنات کے ماحول سے دور ہوکر ان موجودات کی چار دیواری سے نکل کر ۔اس مادی حصار کی دیوار کو پھاند کر اس حقیقت کے اور اک پر یہ اپنی طبیعت کو کیونکر متوجہ کرے ؟اسی کا نتیجہ یہ ہے

کہ ماننے میں عذر ہوتا ہے ۔اگر مان بھی لیتا ہے تواس کے اوصاف ویسے ہی قرار دینے لگتا ہے جو مادی چیزوں میں اس کی آنکھوں کے سامنے آ چکے ہیں ۔

☆☆☆☆☆

تیسرا سبب

دنیا میں انسان ہر چیز کو اس کی نفی سے سمجھتا ہے۔ آپ نور کو کس طرح سمجھے؟ ظلمت سے !میں سچ کہتا ہوں ذرا اپنی طبیعت کو ان ظاہری احساسات سے الگ کر کے تھوڑی دیر کے لئے یہ مانئے کے کبھی رات نہیں ہوتی۔ہمیشہ دن رہتا ہے تو آپ مشکل سے اس کو مانیں گے کے روشنی بھی کوئی چیز ہے۔ آپ جب آنکھ سے دیکھتے ہیں ۔یہ دیوار دیکھائی دیتی ہے ۔وہ درخت دیکھائی دیتا ہے ۔آسمان، زمین،جانور، آدمی غرض یہ اجسام ہیں جن کے رنگ اور شکل کا مشاہدہ ہوتا ہے اس کے علاوہ نور کوئی چیز نہیں ہے جو دکھلائی دے۔

انسان کو یہ سمجھنے کا کافی موقع حاصل ہے کے جو کچھ ہے وہ یہی اجسام اور ان کے الوان اشکال بس اس کے علاوہ نور کوئی چیز نہیں ہے۔ لیکن جب رات آتی ہے اور پردہ ڈالتی ہے اور اس وقت چیزیں سب رہتی ہیں ۔ ان کے لون و شکل بھی قائم رہتے ہیں مگر وہ دکھلائی نہ دیتیں۔اس وقت سمجھ میں آتا ہے کے کوئی چیز اور بھی تھی جس کا نام تھا"نور" وہ سب اس کا فیض تھا اور اس کے نہ ہونے سے اب یہ عالم ہے۔ یعنی عالم کائنات میں احساس نور نام ہے احساس اشیاء کا ۔اس نور کا احساس آپ کو اس وقت بھی نہیں ہے۔ اشیا کا احساس ہونے لگا اور سمجھے کے نور یہی ہے۔ لیکن سمجھے یہ اسی وقت

جب ایک وقت میں نور نہ رہا اور احساس اشیا غائب ہوگیا۔پھر اگر فوردہ ہو جو کبھی غائب نہ ہو تو اس کی قدر کس طرح ہو؟میرا مطلب یہ ہے کے اگر عالم ادراک و اطلاع انسانی ہیں عالم مشاہدہ و ملاحظہ میں کوئی ایسا وقت اور ایسا دور آیا ہوتا کے جب خدانہ ہو تو خدا کا ماننا بہت آسان ہو جاتا اور سمجھ میں آ جاتا کے خدا وہ ہے جس کے ہونے سے یہ فائدہ ہے اور نہ ہونے سے یہ نقصان ۔ مگر وہ تو نور حقیقت ہے جو کبھی غروب کرنے والا نہیں ہے اس لیے انسان جلدی سے یہ کہنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے کے جو کچھ ہے وہ یہی کائنات عالم ہے اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے ۔

☆☆☆☆☆

چوتھا سبب

ہر چیز کے ما بعد کا پتہ اس وقت چلے گا جب ماقبل کی انتہا ہو جائے۔اور جب ابتدا کی منزل پہلے ہے اتنی وسیع ہو کے اس کی حد آخر تک انسان نہ پہنچ سکے تو بعد کی سرحد کا سراغ کیسے ملے گا۔ اگر عالم امکان کو انسان سمجھ لیتا تو دجوب کی حد کو سمجھنا آسان ہوتا لیکن اگر امکان کے حدود اتنے وسیع ہوکے ایک کوتاہ نظر انسان کی وسعت حوصلہ ان کے سامنے انتہائی مختصر ثابت ہو تو پھر دجوب کی منزل کا پتہ کیونکر لگے ۔

ایک انسان جو کے ہندوستان میں پیدا ہوا اور ہندوستان کی وسیع فضا کے اندر جس جگہ پہنچتا ہے اور پہنچتا ہے یہ کون جگہ ہے؟ معلوم ہوتا ہے ہندوستان ہے اور فرض کیجئے اس کے ذرائع بھی انتہائی محدود ہیں کے کسی دوسری جگہ سے کوئی خبر بھی اس کو نہیں پہنچتی تو وہ یہ طے کرے گا کے دنیا بس

جو کچھ ہے وہ ہندوستان میں محدود ہے ۔اسی کا نتیجہ ہے کے سابق زمانہ میں دنیا ربع مسکوں میں منحصر سمجھی جاتی تھی۔ بڑے سے بڑا ذیعلم اور فلسفی انسان بھی تمام دنیا کو زمیں کے اس چوتھائی حصے میں محدود سمجھتا تھا اس لیے کے امریکہ کا انکشاف نہیں ہوا تھا۔ یہ کیا ہے ؟

اس کے معنی یہ ہیں کے انسان تنگ نظر واقع ہوا ہے۔ حالانکہ ہماری اطلاع محدود ہے اور واقع ہے لامحدود مگر ہم ہمیشہ واقع کو اپنی اطلاع کے دائرہ میں محدود کر دیتے ہیں۔ یہ تنگ نظری کوئی پرانے زمانے کے قدیم آدمیوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس زمانہ کے بڑے سے بڑے تعلیم یافتہ لوگ اس تنگ نظری میں مبتلا ہیں اس لیے کے ہمیشہ وہ واقعیت کو اپنے انکشاف کا پابند سمجھتے ہیں۔

اب عالم امکان میں اگر انسان کے حدود اطلاع نقطہ آخرین تک پہنچ جاتے تو آسان تھا کے انسان حد وجوب میں قدم رکھے۔ یعنی مافوق الطبیعیات وہ اتنا بلند مرکز ہے کے انسان اگر طبیعیات کی منزل کو ختم کر دیتا تو پھر اس کا ذوق تحقیق آگے جانے پر آمادہ کرسکتا تھا۔لیکن خود طبیعیات کی دنیا اتنی وسیع ہے کے انسان جتنی تحقیق کرتا ہے وہ اس کی منزل آخر تک نہیں پہنچتا ہے تو اب ایک مرتبہ وہ اس تمام عالم سے اپنے نقطہ نظر کو بلند کر کے اس وسیع عالم میں کیسے داخل ہو جائے جو اس کی حد ادراک سے بلند اور بالاتر ہے۔اس سے ایک خاص بات پیدا ہوتی ہے ۔

غور سے ملاحظہ ہوایک وقت وہ تھا کے جب اسرار کائنات کی تہہ تک پہنچنے کی انسان کو جستجو نہیں پیدا ہوئی تھی۔ یعنی یہ دنیا ایک راز سر بستہ کی حیثیت سے تھی تو اس وقت خدا کو پہچاننا پھر بھی آسان تھا۔ لیکن جب انسان جستجو میں مصروف ہوا اب خدا کی معرفت کی منزل اور بھی دور ہوگئی۔ یہ کیا

ہوا؟ ہوا یہ کے اس وقت تک تو انسان اس تمام دنیا کو ایک لپٹی ہوئی سربمہر صورت سے دیکھتا تھا اور پھر اس کے خالق کا پتا چلاتا تھا۔ اس نے تمام دنیا کو ایک چیز قرار دیا اور کہہ دیا کے اس کا کوئی پیدا کرنے والا ضرور ہے۔ اس طرح پہچاننا آسان تھا مگر جب سے انسان دنیا کے اسرار کی چھان بین میں پڑا یعنی سائنس اور فلسفہ کی بنیاد پڑی، اور اسرار ہستی پر غور کیا جانے لگا۔ اس وقت سے یہ ہوا کے انسان جدید چل رہا ہے اب تو وہ اس دنیا کے پردوں کو ہٹھا رہا ہے۔

اس کی گہرائیوں میں جھک جھک کر نظر ڈال رہا ہے اس کے ورقوں کو الگ الگ کررہا ہے۔ پہلے اسکی حیثیت یہ تھی جیسے ایک کتاب میں نے آپ کو دی ۔ آپ نے اس پوری کتاب کو لیکر اس کے اوپر ایک غلاف چڑھا دیا اور اس پر لکھ دیا کے یہ میری ملکیت ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کے آپ چاہتے ہیں اس کے ورقوں کو جدا جدا کر کے ان کا مطالعہ کر کے پوری کتاب کے مطلق کوئی رائے قائم کریں۔ یہ بہت دیر کا کام ہے۔ چیز وہی ہے۔ مگر پہلے وہ اجماعی شکل سے بند تھی اور اب وہ اپنے اجزا کے ساتھ ساتھ کھلی ہوئی ہے۔

میں آخر میں وہی پہنچ جاؤں گا جہاں پہلا انسان پہلے ہی پہنچ گیا تھا ۔مگر اسی وقت تو جب آخر تک پہنچوں۔ بےشک انسان ان اسرار و رموز میں پڑ کر اس کی معرفت سے دور ہوگیا بجائے اس کے کے وہ قریب ہو اس لیے کے وہ راستے میں ہے۔ اس نے عناصر میں عناصر اور اجزائے ترکیبی پیدا کئے ہیں ۔خوردبین اور دور بین کی ایجاد سے اس نے انتہائی چھوٹے جراثیم اور کیڑوں کا مشاہدہ کیاہے۔ ان کو چلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ مجتمع ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ وہ اپنی تنگ نظری سے یہ کہنے لگتا ہے کے یہ

دنیا انہی کیڑوں کی بنائی ہوئی ہے۔ بات یہ ہے کے ذوق تحقیق نے اس کو ایک وسیع عالم اسباب میں لاکر ڈال دیا ہے جس کی انتہا اس سے بہت دور ہے۔ اس لیے وہ درمیان کی ہر کڑی کو انتہائی سمجھ لیتا ہے اور حقیقی انتہا سے بے خبر رہتا ہے۔ وہ ان تمام مادی اسباب کے منازل کو اگر طے کر لے تو اور آخر تک پہنچ جائے تو خدا کے وجود کی منزل آئے لیکن وہ اس پورے سلسلا کو طے کیونکر کرے ابھی تو وہ سمندر کے وسط میں ہے۔ ایک وہ بچہ جو سمندر پر جہاز میں پیدا ہوا۔

ابھی اس کو ساحل تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔ اس کی دنیا وہ سمندر ہی ہے۔ وہ کیسے سمجھے کے خشکی بھی کچھ ہوتی ہے۔ آپ اس سے لاکھ کہیں یہ سمندر تو تم نے ابھی دیکھا ہے۔ اس کا ساحل ہوتا ہے۔ اس کے آگے خشکی ہوتی ہے ، درخت ہوتے ہیں ۔ وہ اس سے بالکل عجیب بات سمجھے گا کیونکہ اس کے مشاہدہ اور اطلاع کی حدیں اس سے بہت مختصر ہیں اسی طرح یہ انسان ہیں اس عالم امکان میں اپنی کشتی کو ڈالے ہوئے ہے۔ اگر یہ حدود مشاہدہ کا پابند رہے تو یاد رکھیے کے یہ کبھی اس منزل تک نہیں پہنچے گا اس لیے کے کائنات کا وہ بےپایاک دریا ہے جسے انسان کبھی طے نہیں کرسکتا۔ اس عالم اسباب و مسبیات کی زنجیر اتنی ہی طولانی ہے جتنے اس عالم کے اجزاء ہیں۔

اب کتنی مشکل بات ہے کے دنیا کے اس وسیع سلسلہ کائنات میں سے کسی ایک چیز کو لے کر ان لوگوں سے جو خالق کے وجود کے قائل ہیں یہ مطالبہ کیجئے کے اس چیز کے وجود کا کیا سبب ہے۔ خالق نے اس کو کیوں پیدا کیا۔ جب نہ سمجھ میں آئے تو کہہ دیا جائے کے خالق کوئی ہے ہی نہیں۔ اس کو میں مثال دے کر سمجھاؤ۔ ریل گاڑی ہے۔ وہ جارہی ہے آپ بھی ایک ڈبے میں تشریف رکھتے ہیں۔ گاڑی جاتے جاتے رک گئی۔ ادھر دیکھا ادھر دیکھا۔ سٹیشن نظر نہیں آتا۔ جنگل ہے۔ مگر

گاڑی ٹھری ہوئی ہے۔ اب آپ کو گاڑی رکنے کے سبب کی تلاش ہوئی۔ جس ڈبے میں بیٹھے تھے اس کے نیچے دیکھا اوپر دیکھا۔ چھت کو دیکھا۔ دیواروں کو دیکھا۔ پہیوں کو دیکھا ۔ پٹڑی کو دیکھا۔ سب ٹھیک کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ پاس والی گاڑی کو اس طرح دیکھا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تیسری گاڑی دیکھی کچھ نہ معلوم ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیوں گاڑی رکی۔ میں سچ کہتا ہوں کے آپ کبھی نہیں سمجھے گے کے گاڑی کیوں رکی جب تک کے اس پوری گاڑی کے تمام ڈبوں کو طے کر کے انجن تک نہ پہنچے وہاں یہ راز منکشف ہوگا کے گاڑی کیوں رکی لیکن اگر آپ کے قدم سعی نے اس کے پہلے ہی جواب دے دیا تو آپ کہتے رہیے گا کے میں نے بہت تحقیق کیا مجھ کو پتا نہ چلا کے گاڑی کیوں رکی ہے بس ایک معمولی مثال ہے اس نظام کی جو اس دنیائے کائنات میں کار فرما ہے۔

آپ چاہتے ہیں کے اس میں کی ہر چیز کا سبب خود اس چیز میں مل جائے۔ یہ درخت سے پتا ٹوٹ کر گرا ۔ ہے بہت معمولی چیز۔ مگر یہ پتا کیوں گرا وہ ہوا کا جھونکا چلا ۔ وہ ہوا کا جھونکا کہاں سے آیا۔ یہ ایک جھونکا ہوا کا معمولی چیز نہیں ہے۔ تمام عالم کائنات میں ایک عظیم الشان انقلاب اور تموج ہوا ہے جو آپ کو جھونکے کی شکل میں محسوس ہوا اور اس کا ایک معمولی نتیجہ تھا کے پتا درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گرا۔ اس ایک واقع کے سبب کو مکمل طور پر آپ سمجھنا چاہیے تو تمام کائنات کو اپنے سامنے لایئے۔ جس وقت تک یہ پورا سلسلہ علل و اسباب کا سامنے نہ ہو اس وقت تک انسان ایک ایسے معمولی حادثہ کی علت سمجھنے سے قاصر ہے۔

یہ نظام عالم آپس میں بالکل متصل اور ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ اگر انسان اس سلسلہ اسباب کی جستجو میں مصروف ہو جائے گا تو اس کی عمر وفا نہیں کرے گی۔ وہ درمیانی راستے ہی میں رہ جائے گا۔

پھر گاڑی کے تمام ڈبے ختم ہو اور انجن تک پہنچے تو معلوم ہوا کے وہاں ایک ڈرائیور موجود ہے۔ جو اس تمام گاڑی کا چلا رہا ہے۔ اور اسی کے چلانے سے گاڑی چلتی ہے۔اور اس کے روکنے سے پوری گاڑی رک جاتی ہے۔ ہم عالم کائنات کے ابتدائی حدود میں رہتے ہوئے اس انتہائی منزل کا پتا کیونکر لگائیں جو بالکل آخری اور سب سے اول ہے۔ سمندروں کی طے میں رہنے والے جانوروں کو کیا معلوم کے بالائی سطح سمندر کی ہم سے کتنی دور ہے۔

وہ تو جدھر دیکھتے ہیں پانی ہی پانی نظر آتا ہے ۔ اور کچھ نہیں۔ ہماری حیثیت اس دنیائے امکان میں بالکل ویسی ہے جیسے سمندر میں ایک قطرہ ۔ اس کے باوجود ہم چاہتے ہیں کے پہنچے اس سمندر کے اس آخری نقطہ تک جو اول بھی ہے۔ انسان اپنے مشاہدات کی دنیا میں ضرور گم ہو جائے گا اسی طرح جیسے قطرہ سمندر میں گر کر بے نشان ہوجاتا ہے ۔ یہ وجہ ہے کے خدا کی معرفت انسان کے لیے انتہائی دشوار ہے۔

☆☆☆☆☆

پانچواں سبب

کسی چیز کو سمجھانے کے لیے دنیا میں دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک اشارہ دوسرے الفاظ، ایک گونگا انسان جو زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتا اگر پانی مانگے تو اشارہ کرے گا۔ پانی کی حقیقت کو سمجھانا چاہیے گا تو پانی لاکر دیکھا دے گا مگر ایک گویا انسان جو قوت تکلم رکھتا ہے وہ اس لفظ کو زبان سے کہدیگا جو اس حقیقت کو بتلائے۔ وہ عربی، فارسی، اردو وغیرہ جس زبان میں کلام کرنا چاہتا ہے اس زبان کی لفظ جو استعمال کریگا یہ الفاظ ذریعہ ہونگے۔ اس حقیقت کو بتانے کے جو دوسرے تک پہنچانا مقصود ہے۔

یہی دو طریقے ہیں جن سے دنیا کی کوئی حقیقت سمجھائی جاتی ہے ان میں واضح طریقہ لفظ ہی کا ہے ۔ اشارہ محدود ہے اس میں اتنی افادیت نہیں ہے جتنی لفظ میں مضمر ہے۔ الفاظ ہی کا ذریعہ وہ ہے جو انتہائی کامیاب ذریعہ ہے حقیقتوں کو پہونچانے کا۔

خدا جس کو کہتے ہیں جس وقت میں ہم اسے سمجھانا چاہیں تو اشارہ کے حدود تو بہت پہلے ہی ختم ہو جاتے ہیں اس لیے کہ اشارہ ہمیشہ مادی چیزوں کی طرف ہوتا ہے مگر مادہ کا شائبہ جہاں نہیں وہاں اشارہ کی گنجائش ہی نہیں۔ جدھر بھی اشارہ کیا جائے اسی سمت کا نقطہ اس اشارہ کا مرکز قرار پائے گا۔ اس کو حکمائے قدیم یہ کہتے تھے کے فلک الافلاک تک جاکر ٹھرتا ہے۔

سامنے، پس پشت، داہنے، بائیں، فوق تحت۔ یہ چھ مقابل کی جہتیں ہیں جو انسان کے تصور میں آتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان ہی کے درمیانی حدود ہیں۔ بات یہ ہے کے تین طرح کی مسافتیں ہیں طول عرض اور عمق۔ ہر مسافت کی ابتدا و انتہا کے لحاظ سے دو جہتیں پیدا ہوتی ہیں۔ طول کے لحاظ سے فوق و تحت۔ عرض کے لحاظ سے یمین و شمال۔ عمق کے لحاظ سے قدام اور خلف۔ جو جہتیں جسم میں فرض ہوتی ہیں۔ ان کی حدبندی کرنے والا فلک الافلاک قرار دیا جاتا تھا۔

سر کے اوپر کی جانب اشارہ کیا تو یہ خط موہوم فلک الافلاک تک پہنچا۔ پیروں کے نیچے کی طرف اشارہ کیا تو زمین کے طبقوں کو توڑتا ہوا یہ پھر فلک الافلاک تک پہنچا۔ اسی طرح داہنے اور بائیں اور سامنے اور پس پشت۔ یہ تمام اشارے آخر فلک الافلاک ہی تک پہنچے ہیں۔اب کی تحقیقات میں فلک الافلاک کچھ نہ سہی۔ بہر حال فضا کی محیط جس کی انتہا معلوم نہیں ہوسکی۔ اسی کی طرف یہ تمام اشارے جاکر منطبق ہونگے۔ لہذا ان اشاروں کے حدود میں وہی چیزیں آسکتی ہیں جو فلک الافلاک یا اس فضائے محیط کے اندر ہوں لیکن اگر ایسی ہستی ہو کے جو جہات کے حدود سے باہر ہے اس کے متعلق اشارہ

کیونکر ہوسکتا ہے۔یہ اہل مذاہب کا ایک تعبیری انداز ہے کے انہوں نے خدا کے لیے ایک بلندی کی جہت کو مخصوص کرلیا ہے اس لیے دعا کو بھی ہاتھ اٹھاتے ہیں تو اوپر ہی کی طرف ورنہ حقیقتاً اس کی ذات کے ساتھ فوق اور تحت کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے ۔ قرآن مجید کی ایک آیت میں یہ موجود ہے کہ

"فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰه"

ترجمہ :"جدھررخ کروگے اسی طرف خدا مل جائیگا "

(سورۃ البقرہ: 115)

لیکن یہ اعتباری حیثیت سے کچھ شایان شان نہیں معلوم ہوتا ہے کے پستی کی طرف اس کی نسبت دی جائے اس لیے بلندی کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہیں ۔ پھر جب وہ تمام حدود و جہات سے بالاتر ہے تو اشارہ اس کی طرف کیونکر ہوسکتا ہے۔

اچھا اب دوسرا ذریعہ یعنی الفاظ کا۔ یہ بہت ہمہ گیر ذریعہ ہے دنیا کی حقیقتوں کے سمجھانے کے لیے۔ کیوں کے اشارہ مادی چیزوں میں محدود ہے وہ بھی وہ جو ظاہری طور پر محسوس ہوسکے اس لیے ہوا کی طرف اشارہ نہیں کرسکتے۔ یوں ہی کیفیتیں مثلاً درد، خوشی، رنج، بھوک، پیاس ان سب کے بتلانے کا واضح اور آسان ترین طریقہ الفاظ کا ہے۔

لیکن اس آسان اور کامیاب طریقہ میں بھی ہم کو اس مقام پر دشواریاں محسوس ہورہی ہیں اس لیے کے لفظیں ہماری پیدا کی ہوئی ہے۔ ہماری زبان۔ہماری آواز۔ ہمارے ذہن نے ان تمام لفظوں کو خلق کیا ہے۔ ہم نے حروف کی ایجاد کی ان کو آپس میں جوڑا توڑا مروڑا ان سے الفاظ کی تشکیل

ہوئی۔ ہم نے اپنی ہی ضرورتوں کے لحاظ سے ان کو ایجاد کیا ورنہ الفاظ عالم تصور میں محدود نہیں ہیں۔جس چیز کو سمجھانا ہوا ایک لفظ وضع کرلی ضرورتوں کی بنا پر الفاظ کی تشکیل ہوتی گئ۔ اس لیے آپ دیکھیے جتنا زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے نئ نئ ایجادیں ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ الفاظ پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ ایجادیں نہ تھی لفظیں بھی نہ تھیں۔

جب ایجادیں ہوئیں تب لفظیں بھی ہوگئیں۔

معلوم ہوا کے الفاظ ہمارے روزمرہ کے ضروریات کے حدود میں محدود ہیں۔ پھر الفاظ میں اتنی وسعت کہاں ہوسکتی ہے کے وہ اس حقیقت کو بتلا دیں جو ہماری پیدا ہونے والی ضرورتوں کے حدود سے آگے ہے۔ہم اس کے بتلانے کے لیے مجبور ہوکر وہی الفاظ صرف کرتے ہیں جو حقیقتاً ہم نے اپنے ماحول کی مطابقت سے وضع کیے ہیں ۔ اس لیے وہ اس کو پورے طور پر سمجھا نہیں سکتے۔

مثال کے طور پر یہ ہے کے ہمارے افراد میں بعض کے لیے بعض چیزیں منکشف ہوتی تھی اور بعض ان کو نہیں جانتے تھے۔ہم نے اپنے جاننے اور نہ جاننے کے لیے "عالم " اور " جاہل" کے الفاظ ایجاد کیے۔ مگر یہ علم ہم میں ایک صفت کی حیثیت رکھتا ہے جو ہماری ذات سے جدا گانہ ہے۔ اب اگر ہم خدا کی اس شان کمال ذاتی کو جو تمام اشیاء کے اس کے سامنے منکشف ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے بتلانا چاہتے ہیں تو " علم" ہی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس میں وہ بات ضرور پیدا ہو جاتی ہے کے گویا یہ ذات سے الگ کوئی چیز ہے ۔

یونہی ہم نے دیکھا کے ہم کسی بات کو کرسکتے ہیں۔ اس کے لیے ہم نے قدرت کے لفظ کو وضع کیا۔ لیکن ذات سے جدا گانہ ہونے کی خصوصیت اس میں بھی موجود ہے۔ ہمیں کسی شئے کو دیکھ کر تاثر

ہوتا تھا اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ ہم نے اس کے لیے ”رحم “ کا لفظ وضع کیا۔جس کو اردو میں کہتے ہیں" ترس کھانا" اب میں چاہتا ہوں کے خالق کی وہ توجہ جو اس کے بندوں کی طرف ہوتی ہے اس کی خلقیت کے تقاضے سے اس کو سمجھاؤں اس "رحم" کے لفظ سے۔مگر ادھر میں نے رحم کہا ادھر ایک طرح کے نفسانی تاثر کا پہلو پیدا ہوگیا۔ ہم سمجھے کے اس کا دل بھی اسی طرح کڑھتا ہے جیسے ہمارا حالانکہ یہ غلط ہے ۔

یہ چیزیں تو مزاج کا نتیجہ ہیں اور خدا طبیعت و مزاج وغیرہ سے بری ہے۔کوئی ہماری خلاف ورزی کرتا ہے اور ناگوار طبیعت بات کرتا ہے۔ ہم غصہ سے بھر جاتے ہیں۔ دل میں معلوم ہوتا ہے شعلے بھڑک رہے ہیں جس طرح ایک غار ہو اس میں آگ سلگ رہی ہو لیکن منہ اس کا بند ہو جس کی وجہ سے دھواں باہر نہ نکل سکتا ہو۔ بس یہی حالت ایک مغلوب الغضب انسان کی غصہ میں ہوتی ہے۔ خدا اپنی حکمت اور نظام عدل کی رو سے نافرمان بندوں کو اپنی جانب سے سزا کا مستحق قرار دیتا ہے۔ اس کے لیے ہم کیا لفظ استعمال کریں۔ مجبوراً وہی غضب کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن نفسانی جذباتی کیفیت کا پہلو فورا ذہن میں آجاتا ہے جو خدا کی شان کے شایان نہیں ہے اسی طرح ہماری طبعیت کو جھکاؤ کسی طرف پیدا ہوتا تھا ۔

اس کے لیے ہم نے لفظ " محبت " کی ایجاد کی تھی ۔ اب وہ خاص تعلق جو خالق کو مخلوق کے ساتھ ہے۔ جس میں اضافہ ہوتا ہے اطاعت شعاری کی وجہ سے اس کے لیے ہم کیا کریں۔ ہمیں لفظ نہیں ملتا۔ اس لیے مجبور ہیں۔ محبت ہی کے لفظ کو استعمال کرتے ہیں مطلب یہ ہے کے اگر ہم جائزہ لیں جتنے الفاظ ہم خدا کے بارے میں استعمال کرتے ہیں اگر ان کے معنی پر غور کیا جائے تو سب ہمارے ہی حالات و کیفیات کے مطلق ہیں اس لیے اگر ہم ذرا ذہن کو وسیع نہ کریں اور حقیقی مفہوم کو پابند

بنا لیں ان الفاظ کے ظاہری معنی کا تو وہ خدا خدا نہ ہو گا بلکہ وہ وہی ہو گا جیسے ہم سب ہیں۔ معلوم ہوا کے یہ الفاظ اس احاطہ کمال تک پہنچتے ہی نہیں جو خدا کے شایانِ شان ہے اس لیے ایک بہت بڑی مشکل انسان کو اس کے سمجھنے اور سمجھانے میں پیش آگی کے ہم الفاظ وہ کہیں جن سے مادیت ٹپکتی ہے اور مراد وہ ہو جو مادیت سے بالکل علیحدہ ہے۔

ہر لفظ میں ضرورت ہوگی کے تھوڑا سا معنوی تصرف کریں تب اس پر اطلاع کریں۔ نتیجہ یہ ہو گا کے الفاظ پیچھے رہ جائیں گے اور مراد آگے نکل جائے گی پھر اگر کوئی شخص اپنی عقل سے اس کو سمجھے ہوئے نہیں ہے تو الفاظ میں اس کو کیونکر سمجھایا جائے۔

☆☆☆☆☆

چھٹا سبب

انسان کی طبیعت کا خاصہ ہے کے جو بات کثرت کے ساتھ دیکھے اسی کو عمومیت کا درجہ عطا کردے۔ مثلاً کسی موضع میں سو آدمی ہوں۔ وہ ایک ایک کے متعلق دریافت کرے کے فلاں شخص سید ہے؟ فلاں سید ہے۔ یوں ہی اسی نوے آدمیوں کے متعلق وہ پوچھے اور اسے یہی معلوم ہوتا رہے کے وہ سادات ہیں تو بقیہ کم تعداد افراد کے متعلق اب وہ دریافت نہ کرے گا خود ہی سمجھ لے گا کے وہ بھی سادات ہیں اور اب جو کہیں بیان کرے گا تو وہ کہے گا کے فلاں موضع میں سب سادات ہی سادات ہیں ۔

یہ کیا ہے ؟ وہی نادر افراد کا غالب کے ساتھ منضم کرنا جو عام طور پر آسانی طبیعت میں مضمر ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کے انسان بعض احکام کلیہ کے طور پر ایسے بنا لیتا ہے جو بات تحقیقات کے غلط ثابت

ہوئے ہیں کیوں کے اس نے غالب افراد کو دیکھا تھا اور اسے معلوم نہ تھا کے شاذ و نادر کوئی فرد اس کے خلاف بھی ہے۔صول" استقرار" یعنی غالب افراد کو دیکھ کر کلی حکم لگانا، اس پر جب انسان چلتا ہے اور عالم وجود میں جائزہ لیتا ہے تو کوئی چیز اسے ویسی نظر نہیں آتی جیسا خدا کو بتایا جاتا ہے۔

وہ جہاں تک جستجو کرتا ہے ہر چیز حادث ہے، محدود ہے۔ مکان و محل میں پائی جاتی ہے عوارض و صفات کی حامل ہے اس کے بعد انسانی کمزوری کہلا دیتی ہے کے جو بھی موجود ہو گا وہ ایسا ہی ہو گا۔یہ استقرار یعنی انسان کا جزئیات کو دیکھ کر حکم لگانا انسان کو خدا کے راستے سے الگ کر دیتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو آجکل بہت بڑی سد راہ ہو رہی ہے۔

اس زمانہ میں طبیعتوں پر استقرار کا زیادہ غلبہ ہے۔ ایک زمانہ تھا کے آنکھوں کو بند کر کے عقل سے کام لے کر اصول بنائے جاتے تھے ۔ یہ اصول اب دنیا والے پسند نہیں کرتے موجودہ زمانہ کے احکام جن پر سائنس کی بنیاد ہے۔ پہلے دیکھو پھر کلیہ بناؤ۔

اسی بنا پر آپ دیکھیں گے کے اس زمانہ میں خدا کے انکار کی آواز زیادہ ذہنوں سے آتی ہے ۔ اس لیے کے سابق و حال کے فلسفہ کا طرز استدلال ہی بدل گیا ہے۔اس زمانہ میں موجودات کو دیکھ کر کلیہ بنایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کے موجودات کو دیکھ کر جو کلیہ بنے گا وہ اس دائرہ میں محدود ہو گا جو انہی موجودات کا دائرہ ہے۔ لیکن جو چیز کے ان موجودات کے حدود سے بالاتر ہو اور بااعتبار ذات و حقیقت ان سے بالکل علیحدہ ہو اس پر یہ کلیے منطبق نہیں ہونگے۔لیکن انسان کی افتاد طبع یہ ہے کے وہ سمجھتا ہے جو کلیہ میں نے بنایا ہے وہ بالکل ٹھیک ہی ہے۔ جب وہ سنتا ہے کے خدا اس طرح کی چیز نہیں ہے تو وہ انکار پر آمادہ ہوجاتا ہے اور کہتا ہے کے پھر وہ کوئی چیز ہی نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

ساتواں سبب

انسان نے اپنے دماغ سے کچھ اضداد جمع کر لئے ہیں اور وہ سمجھتا ہے کے ہر چیز ان ہی اضداد کے دائرہ کے اندر ہو گی ۔ مثلاً حرکت اور سکون ۔ ہر شئے اس کے خیال میں یا ساکن ہو گی یا متحرک ۔ اسی طرح مختلف رنگ ۔ وہ کسی شئے کو پونچھتا ہے کہ وہ سیاہ ہے کہیے گا نہیں تو وہ سمجھے گا پھر سفید۔ کہیے نہیں تو وہ سمجھے گا زرد ، سرخ وغیرہ۔

اسی طرح بڑائی ، چھوٹائی،دوری نزدیکی۔یہ اضداد اس کے نزدیک وسیع اور جامع ہیں ۔لیکن جب خدا کو ماننے والے خدا کو پیش کرتے ہیں تو وہ ان تمام اضداد کی نفی کر دیتے ہیں ۔دنیا پوچھتی ہے وہ متحرک ہے ؟ جواب ملتا ہے نہیں متحرک نہیں ہے، تو پھر ساکن ہے؟ نہیں ،ساکن بھی نہیں ۔ سفید نہیں ، سیاہ نہیں ۔ کسی رنگ کا نہیں ، چھوٹا نہیں ، بڑا نہیں ،دور نہیں ، نزدیک نہیں ،گھبرا کر گھبرا کر انسان صفتیں تلاش کرتا ہے اور جواب دینے والا نہیں نہیں کی رٹ لگائے جاتا ہے ۔

نہ مقدار ہے ، نہ عدد ہے ،نہ طویل ہے ، نہ عریض ہے ، نہ عمیق ہے ، نہ رنگ ہے ، نہ بو ہے ، نہ مزہ ، محدود انحیال انسان اس نہیں نہیں، نہیں نہیں کو سن کرایک مرتبہ کہہ دیتا ہے کے پھر وہ کچھ بھی نہیں ہے ۔ آپ کہتے ہیں واہ !ہے تو سب کچھ وہی ، بلکہ جو کچھ ہے وہ اس کی بدولت ہے ۔اب بھلا ایک انسان جو اس مادی احاطہ میں مقید ہو ۔ ان مادی آنکھوں سے دیکھتا ہو ، مادی کانوں سے سنتا ہو وہ کیا کرے ، کیونکر مانے کس طرح سمجھے ؟ بڑی دشوار بات ہے ۔

☆☆☆☆☆

آٹھواں سبب

علم و ادراک کس چیز کا نام ہے ؟ آپ اگر غور کرینگے تو معلوم ہو گا کہ وہ ایک طرح کا احاطہ ہے جو ادراک کرنے والے کو اس شئے پر جس کا ادراک کیا ہے حاصل ہوتا ہے، وہ اسے گھیر لیتا ہے ، اس کا نام ہے ادراک اس کے لیے جتنے الفاظ ہیں وہ ایک طرح کے غلبہ کا پتہ دیتے ہیں۔ ادراک کے معنی میں " پالینا" " اطلاع" اس کے معنی ہیں اوپر سے کسی شئے پر جھکنا " واقفیت" اس کے معنی ہیں کسی شئے پر ٹھرنا۔

عالم حقیقتاً معلوم پر محیط ہوتا ہے۔ اور یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ محدود کے لیے احاطہ غیر محدود کا غیر ممکن ہے۔ انسانی ادرکات، انسانی احساسات، انسان کا ذہن سب محدود ہے اور خدا جس کا نام ہے وہ لامحدود ہے۔ پھر محدود چیز اس لامحدود کو کس طرح سے گھیر لے تاکہ اس کا علم حاصل ہو۔

☆☆☆☆☆

نواں سبب

ایک ایسی دشواری ہے جو مخصوص اشخاص کے لیے پیش آتی ہے۔وہ اپنے شخصی ماحول کا اثر ہے انسان اگر ایسی فضا میں گھر جائے جہاں ہر شخص یہی کہہ رہا ہو کہ خدا کوئی جز نہیں تو انسان غور کرنے کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوسکتا میں سچ کہتا ہوں کہ آج کل جو بچے آپ کے گمراہ ہوجاتے ہیں یعنی خدا کے وجود کے منکر ہوجاتے ہیں اس کا بڑا سبب انکا ماحول اور معلمین کے ذاتی خیالات ہوتے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں نے پرورش پائی ہے لامذہبیت کی فضا میں اور بچوں کو آپ بھیج دیتے ہیں اس وقت جبکہ انھیں مذہبی معلومات حاصل نہیں ہوتی ہیں وہ بالکل خالی الذہن ہیں اس لیے جو نقش ان پر

بٹھلایا جائے وہ ابھر جائیگا اور پھر مٹنا اس کا دشوار ہو گا۔بچوں کو آپ اتنی مسموم فضا میں بھیج دیتے ہیں اس وقت جبکہ کوئی تحفظ کا سامان ان کے لیے آپ نے مہیا نہیں کیا ہے۔ شروع ہی سے ان کے کانوں میں یہ آوازیں پڑنا شروع ہوتی ہیں کہ عقائد سب خرافات و اوہام کا مجموعہ ہیں۔ اب ان کے ذہن میں یہ بات اتر گئی کہ یہ باتیں سب مہمل ہیں ، پھر ان پر غور کرنے میں اپنا وقت کون ضائع کرے۔ بہت سے تعلیم یافتہ لوگ ایسے ہیں کہ انکے دل و دماغ پر فلاسفہ مغرب کا عقلی رعب چھا جاتا ہے۔ اس بنا پر وہ یہ سوچنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوئے ۔

جو کچھ ان میں سے کسی فلسفی نے نظریہ قائم کرلیا ہے وہ غلط ہو اور ہمارے دقیانوسی خیال والے مذہبی رہنما جو کہتے ہیں وہ صحیح ہو بھی سکتا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ آخر اتنے بڑے فلاسفہ وہ بھی تو عقلائے زمانہ ہیں کیسے ممکن ہے کہ وہ خدا کے وجود کا انکار کریں جبکہ وہ عقلی مثیبت سے ایک ثابت حقیقت ہو۔

☆☆☆☆☆

ان مشکلات کا حل

گزشتہ حصہ بیان میں وہ دشواریاں دکھلائی گئی ہیں جو انسان کے لیے خدا کی معرفت کے سلسلہ میں درپیش ہوتی ہیں۔ بعض تعلیم یافتہ احباب نے ان بیانات کو سن کر یہ خیال ظاہر کیا ہے کے یہ دشواریاں اس حد تک پہنچی ہوئی ہیں کے خدا کی معرفت ہو ہی نہیں سکتی یہ بالکل محال ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اتنے بیان کے انتہائی دل نشین ہونے کا نتیجہ ہے۔ اب وقت آیا ہے کہ ان مشکلات کو حل کیا جائے اور بتلایا جائے کے خدا کی معرفت ممکن کس طرح ہے۔

اب تک جتنی بھی دشواریاں میں نے بیان کی ہیں وہ دو حصوں میں منقسم ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کے خدا کی ذات کی پوری معرفت حاصل نہیں ہوسکتی لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کے جزوی معرفت بھی غیر ممکن ہے۔

دوسری قسم کی دشواریاں وہ ہیں جو انسان کے غلط طریقہ استدلال کے سبب سے پیدا ہوتی ہیں اس لیے عقل کی ہدایت سے اس طریقہ استدلال ہی کو پس پشت ڈالنا چاہیے تاکہ خدا کے ماننے میں گمراہی نہ پیدا ہو۔ پہلی قسم وہ ہے جیسے میں نے کہا کے انسان کا دماغ محدود ہے اور خدا کی ذات لامحدود ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کے انسان اگر اس کی ذات و صفات پر تمام و کمال اطلاع حاصل کرنا چاہیے تو غیر ممکن ہے اس لیے کے محدود لامحدود کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ لیکن اگر آپ کسی چھوٹی چیز کو بڑی چیز پر لاکر رکھیئے تو یہ بھی نہیں ہے کہ چھوٹی چیز بڑی کا کوئی حصہ بھی نہ لے سکے۔ سمندر میں ایک سوئی ڈبویئے تو اس کے ناکہ کی بساط بھر پانی اس میں ضرور سما جائے گا۔

اگرچہ سمندر اپنی وسعت سمیت بےشک سوئی کے ناکے میں نہیں سما سکتا۔ پھر آپ سے یہ کون کہتا ہے کے خدا کے ذات و صفات کا انتہائی علم حاصل کیجیے مگر آپ اپنے ذہن کو اس کی ذات کی طرف متوجہ کیجیئے اور غور و خوض سے کام لیجئے۔ جتنی سمائی دماغ میں ہوگی اتنی تو معرفت اس کی حاصل ہی ہو جائے گی۔ پھر انسان کا دماغ بھی عجیب نوعیت رکھتا ہے۔

یہ خود بڑھانے سے بڑھتا ہے اور گھٹانے سے گھٹتا ہے۔انسانی دماغ کی وسعت کوئی مادی وسعت تو ہے نہیں۔ نہ یہ سمائی مادی سمائی ہے یعنی معلومات اس میں یوں تو آتے نہیں جیسے ڈبیا میں پان بھرے جاتے ہیں۔ یہ انسانی دماغ غور و فکر کرنے سے بڑھتا ہے اور جتنا بڑھے گا اتنی سمجھ زیادہ ہوگی۔

معرفت جن حقائق سے متعلق ہے وہ لامحدود وسعت رکھتے ہیں اور ان میں زیادتی اور کمی نہیں ہے۔ نہ ان کی کوئی مقدار مقرر ہے نہ ان میں تغیر ہے نہ تدریج و ترتیب۔ مگر چونکہ اس معرفت کا حاصل کرنا بقدر وسعت ادراک بشری ہے اس لیے کچھ تو دماغی صلاحیت ہی کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے یعنی کچھ انسان وہ ہیں جن میں ذاتا قابلیت ہی کم ہے۔

یہ ایک محدود دائرہ کے اندر وہ ترقی کرسکتے ہیں۔ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اور کچھ استعمال کی وجہ سے فرق ہوتا ہے یعنی جتنا دماغ صرف کیا اتنی دماغ میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ ہر دور میں یہ مکلف ہے اور اس کا فرض ہے اتنی ہی معرفت کا جتنی اس کے دماغ کے لحاظ سے اس کے امکان میں ہے اور پھر اس کے آگے بڑھنا اس کی سعی و طلب سے متعلق ہے جتنا بھی آگے بڑھ جائے پھر بھی یہ محدود ہے اور وہ لامحدود ہے ۔ محدود انتہائی ترقی کرکے بھی لامحدود تک نہیں پہنچ سکے گا۔

اس لیے اگر قاب قوسین تک بھی پہنچ جائے تو کہے گا "جتنا حق پہچاننے کا تھا اتنا نہیں پہچان سکا"۔

اب اگر انسان کے دماغ میں صلاحیت ہی کم ہے تو اس کو سزا نہ ملے گی اس درجہ تک نہ پہنچنے پر جو اس کے امکان سے باہر تھا۔ اس معنی سے کہا گیا کے ایمان کے درجے ہیں ۔ سلمان فارسی اگر نو درجہ پر ایمان کے فائز ہیں تو ہوں۔ ہم میں سے ہر ایک اس کا مکلف نہیں ہے کے اتنی ہی معرفت حاصل کرے جتنی سلمان کو حاصل تھی۔ اور اگر صلاحیت بالکل نہ ہو تو ذمہ داری بالکل نہیں ہے جیسے دیوانہ۔ یہ حقیقتاً انسان نہیں ہے۔

جیسے دوسرے جانور ویسے وہ کیونکہ انسانیت درحقیقت نام ہے اس باطنی شئے کا جس کا نام ہے قوت ادراک ۔وہ اگر معدوم ہے تو صورت انسان کی سی ہو لیکن حقیقت میں وہ انسان نہیں ہے۔ اس لیے

اس پر کوئی تکلیف نہیں ہے۔ کسی نے دیوانہ سے نہیں کہا کے تو خدا کی معرفت کیوں نہیں حاصل کرتا بس جب ہم کو ایک فرد کامل کوتاہی دماغ کی مل گئی یعنی مجنون اور اس کا نتیجہ ہم نے دیکھ لیا تو اسی سے ہم درجے قرار دے سکتے ہیں اور اسی کے لحاظ سے احکام میں توازن قائم کر سکتے ہیں ۔

ایک نیم دیوانہ یعنی مجنوں اور عاقل کے درمیان منزل رکھنے والا انسان جس کو کہتے ہیں سفیہ یعنی خبطی، اس سے کم درجہ والا ۔ یعنی کمزور عقل رکھنے والا جس کو کہتے ہیں احمق اور بےوقوف، ہر ایک میں ذمہ داری اس مقدار بھر ہے جس قدر اس کی عقل ہے۔اس کمزور عقل والے انسان میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ زیادہ سمجھ سکے تو کیسے اس سے یہ چاہا جاسکتا ہے کہ وہ بو علی سینا بن جائے۔ وہ بس جس قدر اپنی امکانی کوشش صرف کر کے سمجھ لے وہی اس کی آخری حد ہے۔ اس کو سزا نہیں دی جاسکتی کے تم نے اس سے بڑھ کر کیوں نہ حاصل کیا۔

بےشک اس سے جزا کبھی اس سے زیادہ استحقاق نہیں ہے۔ یعنی اس کو ایسا اعزاز دے دیا جائے جو اس کی شان سے بالاتر ہے اس کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔ہم نے مانا کے وہ بے قصور ہے۔ اس کا نتیجہ صرف اتنا ہے کے اسے سزا کا مستوجب نہیں ٹھرایا جاسکتا۔ لیکن کوئی ایسا عہدہ و منصب یا اعزاز و اختصاص جو نتیجہ ہے ایک خاص درجہ کے کمال انسانی کا۔ وہ اس ناقص شخص کو کیوں دیا جائے؟

فرض کیجئے کے آپ نے کوئی انعام مقرر کیا ہے اس شخص کے لیے جو ایک خاص سوال کو حل کر دے ۔ اخباروں میں اس طرح کے انعاموں کا آجکل بہت اعلان ہوتا رہتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس سوال کو حل نہ کرسکے ۔ اور مان لیجیئے کے محنت کی کمی یا غور و خوض میں کوتاہی کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا۔ اس نے رات رات بھر دن دن بھر غور کیا، کوشش کی مگر اس کے دماغ میں صلاحیت ہی نہیں تھی۔

بے چارہ ہے ضرور وہ قابل رحم بےشک اگر کوئی اسے سزا دینا چاہیے۔ اسے قید کرے۔مارے۔تکلیف دے اس بات پر کے اس نے سوال کا ٹھیک جواب نہیں دیا تو یہ اس پر زیادتی ہوگی ظلم ہوگا۔ لیکن وہ انعام اس کو مل جائے، اس کی کوئی وجہ نہیں۔اگر آپ نے وہ انعام اس کو دے دیا تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی جو قابل اور لائق تھے اور جنہوں نے سوال کا واقعی صحیح جواب دیا تھا۔

یونہی سمجھ لیجئے ثواب کو جس طرح مجنون سے عقاب ساقط ہے اسی طرح کوئی وجہ نہیں کے اس کو ثواب عطا کیا جائے۔ کہیے کے وہ بے چارہ ہے بےبس ہے۔ بےشک ایسا ہی ہے۔ مگر اس کے لیے اتنا کافی ہے کے اس کو سزا نہ دی جائے ۔یہی کیا کم ہے۔ جن کو جزا ملتی ہے ان کو برائی کرنے پر سزا بھی تو ملتی ہے !!سزا و جزا ، دونوں متقابل چیزیں ہیں۔ آپ سزا میں تو اس اصول کو تسلیم کریں لیکن جزا میں اس کو شریک کرنا چاہیے۔ یہ درست نہ ہوگا۔ فرض کیجئے کے دیوانہ پن کی رو میں صبح سے شام تک کھڑا ہوا وہ نمازیں پڑھے جائے اس نماز کا ثواب کیوں اس کو دیا جائے جب کے یہی اگر کسی کو مارتا پیٹتا تو سزا اس کو نہ دی جاتی ۔

بس اسی طور سے کمی عقل کے مراتب کو سمجھ لیجئے۔ جتنی عقل اتنی جزا و سزا۔ دماغ اپنے تنگ ہونے کی وجہ سے ایک محدود نقطہ تک معرفت حاصل کرتا ہے تو بس اسی نقطہ پر اس کو جزا ملنا چاہیے۔ بےشک سزا نہیں ہوسکتی کے اس سے زیادہ معرفت کیوں حاصل نہ کی۔اسی لئے پیشوایان اسلام کی احادیث میں یہ بتلایا گیا ہے کہ انسان کو بمقدار عقل جزا دی جائیگی۔ وہ مذہب اور ہیں جو عقل پر پہرا بٹھاتے ہیں۔ اسلام کے تو درحقیقت یہ خصوصیات سے ہے کے وہ عقل کو آواز دیتا ہے۔ عقل ہی کو معیار قرار دیتا ہے امام فرماتے ہیں : الْعَقْلُ مَا يَرْضِي بِهِ الرَّحْمَنُ وَيَكْتُبُ الْجَنَانُ.

"عقل وہ ہے جس کے ذریعے سے خدا کو رضامند کیا جاتا ہے اور جنت کو حاصل کیا جاتا ہے"

عقل انسان کی جس قدر ہوگی اسی قدر اس کو بدلہ ملے گا اس لیے کے اطاعت کی بنیاد معرفت پر ہے معرفت کا تعلق عقل کے ساتھ ہے بس جتنا انسان کا دماغ ، اتنا ہی معرفت کا امکان اور اس سے زیادہ انسان مکلف نہیں۔بے شک جتنی وسعت انسان کے دماغ میں ہے اس سے کام لینا ضروری ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے یہ قابل مواخذہ ہے لیکن اپنی صلاحیت کے موافق جہدوجہد کرے تو یہی اس کے لیے کافی ہوگا۔ وہ اپنی وسعت دماغ کے مطابق خدا کے لا محدود صفات کا کچھ نہ کچھ تو ادراک کرے ہی گا۔

یہی اس کے لحاظ سے معرفت کا امکانی درجہ ہوگا۔رہ گئی خدا کو ذات اور اس کے کمال ذاتی کی اصلی حقیقت کی معرفت، اس کا ہر انسان سے مطالبہ نہیں ہے، اور نہ وہ ہر انسان کی قدرت میں ہے۔بلکہ واقع تو یہ ہے کہ خدا کی اصل ذات و حقیقت کی معرفت انسان کے لیے بالکل غیر ممکن اور محال کا درجہ رکھتی ہے جس کے کسی شخص کے لیے کسی وقت میں بھی عالم و قوع میں آنے کا امکان نہیں ہے۔ ذات کہتے ہیں ایک خاص شخصیت وجود کو۔ ذات مفہوم کا نام نہیں ہوتا۔ ذات کلی اوصاف کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ زید کی ذات کیا ہے ؟ وہ وجود خاص۔

یہ خصوصیات کبھی مفہوموں کے اجتماع سے پیدا نہیں ہوسکتی۔ مفہوموں کو جتنا ملایا جائے وہ ہمیشہ کلی ہی رہیں گے۔ ان کے دائرہ میں وسعت ہی رہے گی ان میں شخصی خصوصیات پیدا نہیں ہو سکتی۔زید کے یہاں اس کے گھر میں ایک مولود کی ولادت ہوئی جس کا نام ہے خالد۔ آپ اوصاف و مفاہیم کے ذریعہ سے اس کے تعین ذات کا فائدہ حاصل کیجئے، غیر ممکن ہے کہنے کے فلاں وقت متولد ہونے والا بچہ۔ تو کیا یہ مفہوم ایک ہی میں منحصر ہے۔

اس وقت پر اگر ہزار بچے متولد ہوتے تو ان سب پر یہ مفہوم منطبق ہوتا۔ آپ ایک خصوصیت اور بڑھایئے کہیں کے فلاں گھر میں فلاں وقت پر متولد ہونے والا انسان۔ دائرہ محدود ضرور ہے۔ مگر کیا وہ ایک سے مخصوص ہوگیا۔ اب بھی اگر اسی مکان میں اسی وقت پر کوئی اور بھی ہوتا تو یہ مفہوم اس پر بھی منطبق ہوتا۔ اب اس میں اور خصوصیات بڑھایئے۔ کہنے کے فلاں ماں باپ سے فلاں وقت پر فلاں مکان میں متولد ہونے والا فرزند ۔ اب بہت خصوصیت پیدا ہو گئی۔

یہ بالکل واضح مفہوم ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ انہی ماں باپ کے یہاں اس وقت اسی جگہ یہ نہ متولد ہوتا۔ اور کوئی ہوتا تو اس پر یہ مفہوم صادق آتا الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جائے گا ۔مفاہیم کی سرحد تمام ہو جائے گی ۔ مگر وہ خصوصیت پیدا نہیں ہوسکتی جو شخص کو شخص بنا دے اور جس میں شرکت غیر کی گنجائش نہ ہو۔ جزئیت کہاں سے پیدا ہوتی ہے کوئی وصف نہ بتائیں۔ لے جاکر دکھلا دیجیئے کے " یہ" بس اس " یہ" کے ہوتے ہی وجود خاص کا مفاد حاصل ہوگیا ذات کی تعیین ہوگئی ۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جزئیات کبھی کلیوں کے آپس میں ملا دینے سے تیار نہیں ہوسکتے۔ کلیات جب ایک دوسرے سے ملیں گے تو وہ کلی ہی رہیں گے۔جزئی نہیں بن سکتے۔

مجمع میں سے کسی کی طرف سے سوال جزئیات اضافی میں تو یہی ہوتا ہے " جواب جزئیات اضافی حقیقتاً جزئی ہوتے ہی کب ہیں، انہیں، اضافی کہیں کے معنی ہی یہی ہیں کے وہ بجائے خود کلی ہیں۔ جزی نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کے یہ بجائے خود آپ ہزار مفہوم یکجا کر دیجیئے پھر بھی ان میں وسعت ہی رہے گی۔ یہ اور بات ہے کے اتفاق سے اس کی ایک ہی فرد موجود ہو لیکن اس کی وجہ سے اس کی ذات کی تشکیل کبھی نہیں ہو سکتی ۔ بلکہ ذات کا ادراک اسی وقت ہو گا جب اس کا تشخص و تعیین انسانی ادراک کے حدود میں آجائے۔ اب دیکھیئے کے ذات باری کا تعین اگر انسان کے حدود ادراک میں

آجائے تو یہ محدود ہو جائے گا۔ انسان کو وہاں"یہ" کہنے کی گنجائش ہی نہیں ملتی اس لیے کے اس کا دماغ خیال تمام قوائے عقلیہ مل کر بھی اس تشخص خاص کی صورت گری سے عاجز ہیں۔ ہمارا ادراک تو بس اپنے ہی ایسے تعینات تک محدود ہے۔ لیکن خدا کی ذات یعنی اس کا اصل وجود متعین وہ ہمارے ذہن میں آجائے اور ہم اس سے سمجھ لیں یہ غیر ممکن ہے۔ انسان چاہے کتنا ہی بلند ہو جائے، کتنی ہی معرفت زیادہ حاصل کر لے مگر یہ بات اس کے لیے کبھی نہیں حاصل ہوسکتی۔ یہی وہ چیز ہے جس کے لیے امیر المومنین ارشاد فرماتے ہیں۔" لَا يُدْرَكُهُ بَعْدَ الْهَمِّ، وَلَا يُنَالُهُ غَوْصُ الْفَطِنِ"۔

" اس تک نہیں پہنچ سکتی دور بینی ہمتوں کی اور نہ اس کو پاسکتی ہے غوطہ خوری عقلوں کی"۔

یہ نہیں ہے کے معمولی درجہ کی ہماری آپ کی عقلیں نہیں پہنچ سکتیں بلکہ بالکل تعمیر ہے۔ دنیا کی کوئی عقل اس نقطہ تک نہیں پہنچ سکتی۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

هو القادر الذی اذا ارتمت الاوهام لتدرک منقطع قدرته، وحاول القو المترامن خطرات الوساوس ان بقع عليه فی عميقات غيوب ملكوته،وتولت القلوب ليهلتجری فی كيفيت صفاته،وغم صنت مداخل العقول فی حيث لا تبلخ الصفات۔لتناول علم ذات ردعها وهی تجوب مهاوی صدف الغيوب،متخلصت عليه سبحانه فرجعت اذ جبهت معتر فت،بان لا ينال بجور الا عتسناف كن معرفت۔ولا تخطر ببال اولی الرويات خادامت انقفد،جلال عزته۔

یہاں زور بڑھا دیا گیا ہے کلام کا وہ فرماتے ہیں" وہ ایسا با اقتدار ہے کے جب تو ہمارے ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں اس غرض سے کے اس کی قدرت کی آخری حد کو دریافت کریں اور وسوسوں کی آمیزش

سے پاک و صاف فکر قصد کرے اس تک پہنچنے کا اس کی عظمت کی غیبی گہرائیوں میں اور دل اس کی طرف متوجہ ہو تاکہ اس کی صفات کی کیفیت کو جان لیں اور عقلیں گہرائیوں کی ان حدود میں داخل ہوں جہاں الفاظ پہنچ نہیں سکتے اس کی ذات کا علم حاصل کرنے کے لیے تو وہ ڈانٹ دیتا ہے ان سب کو، اس حالت میں کے جب وہ طے کررہے ہیں گہرائیوں کو غیبی تاریکیوں کی صرف اسی کی طرف لو لگائے ہوئے بس فورا یہ پلٹ آتے ہیں دھکا کھا کر اقرار کرتے ہوئے کے یہ رویوں کی زیادتی سے اس کی معرفت کی اصلی حقیقت حاصل نہیں ہوسکتی اور صاحبان فکر کے دل میں اس کے عزت و بزرگی کی حد مقرر کرنے کا خیال گردش نہیں کرسکتا"۔

یہ درحقیقت ذات الٰہی کی معرفت کی منزل ہے جو انسانی حدود امکان سے باہر ہے اس لیے ہمارا کام کیا ہے؟ ہمارا کام یہ ہے کے ان قریب ترین اوصاف کو تلاش کریں جن کی حقیقت اس کی ذات میں پائی جاتی ہے لیکن اس طرح نہیں جیسے ہم میں ہے۔ہم عقل سے کام لے کر ان نقائص کو دور کردیں جو اس صفت میں ہماری ذات سے متعلق ہیں اور اس کا جوہر کمال اپنے حدود ادراک میں خدا کی ذات کے لیے ثابت کریں۔ یہ خدا کی معرفت وہ ہے جو انسان ہے حد امکان میں ہے اور اسی کا وہ مکلف ہے۔اسی میں مختلف مراتب و درجات پیدا ہوتے ہیں اور ترقی و تنزل کی گنجائش نکلتی ہے۔

دوسری قسم ان مشکلات کی وہ ہے جن کا نتیجہ یہ ہے کے انسان ان مادی معیاروں سے جو اس نے تمام اشیاء کے جاننے کے لیے مقرر کئے ہیں خدا کی معرفت حاصل کرنا چاہیے تو غلطی کرے گا اور اس کی معرفت تک نہیں پہنچ سکے گا لیکن یہ خود انسان کی غلطی ہوگی کے اس نے طریقہ غلط اختیار کیا۔ اس کے لیے مثال بےشک نہیں ہوسکتی اس لیے کے"لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ" ترجمہ :"اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے"۔(سورہ الشوریٰ: 11)۔

لیکن اگر ہم عقل سے کام لیں تو یہی مثالیں اس تک پہنچا بھی سکتی ہیں۔وہ اس طرح کے دنیا کی ان تمام چیزوں میں ہم نقائص اور کمالات کی پہلو کی تلاش کریں۔ پھر ان تمام نقائص کی ہم نفی کر کے محض کمال پر اپنے زاویہ نگاہ کو مجتمع کرلیں تو وہی نقطہ حقیقت ہو گا جو ہماری اصلی منزل ہے۔طبیعت مادی چیزوں سے مانوس ہے، بے شک مگر خود انسان کی نہاد میں غیر مادہ پہلو موجود ہے جو حقیقتاً اس کی انسانیت کا جوہر خاص ہے، وہ اس کو خدا کی معرفت سے بالکل قریب کر دیتا ہے ۔لیکن اس کو اپنی خودی کا احساس ہونا چاہیے تو یہ " خودشناسی" " خدا شناسی" کا ذریعہ قرار پائے گی۔

وجود کے سمجھنے کے لیے عدم کی ضرورت، یہ صرف " تجربہ" کے طریقہ میں محدود بن جانے کا نتیجہ ہے لیکن عقلی ادراکات تجربہ کے محتاج نہیں ہوتے۔ وہ موجودات کو دیکھ کر ہی موجد کا پتہ دیتے ہیں اور حکم لگاتے ہیں کے بغیر موجد کے یہ تمام اشیاء موجود نہیں ہوسکتے تھے اگرچہ اس کے معدوم ہونے کا کوئی تجربہ نہ ہوا ہو۔

انسان عالم کائنات کی سیر میں مصروف ہے مگر خالق کا پتہ لگانے کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ ان تمام کائنات کا مطالعہ کر لے بلکہ ان میں کسی ایک چیز ہی کو لیکر اگر وہ غور کرے تو اس کی سمجھ میں آجائے گا کے اس کے اسباب و علل کی درمیانی کڑیاں جو کچھ بھی ہوں لیکن آخر میں اس کی انتہا واجب الوجود خالق پر ضرور ہے۔

اشارہ، خدا کی ہستی کو معین کرنے میں یقیناً بےکار ہے۔ اور الفاظ بھی اس کی کنہ حقیقت اور واقعی صفات کی صورت کو نہیں بتا سکتے لیکن ان الفاظ کے ذریعے سے جو مفہوم پیدا ہوتا ہے ان میں تھوڑے سے عقلی تصرف کے ساتھ انسان اس کا مال ذاتی کا پتہ دے سکتا ہے۔ عقل کو صرف کرنے کی بے شک حاجت ہے۔ لیکن اس سے انسان کو مفر ہی کہاں ہے۔

"استقرار" یعنی اکثر جزئیات کی بنا پر کلی حکم لگانا کبھی حقیقت کا آئنہ بردار نہیں ہوسکتا۔یہ طریقہ ہی بالکل غلط ہے۔ جب وہ حقیقت ہے ہی ایسی کے اس کے مثل کوئی دوسری چیز نہیں تو ان چیزوں کے مشاہدہ اور تتبع سے جس حکم کی تشکیل ہوگی وہ ذات پر منطبق کیسے ہوگا۔انسان کے ذہن نے اضداد مقرر کر لیے ہیں مگر ان اضداد کا جو محل ہے اسے بھی دیکھنا چاہیے۔ وہ اجسام ہیں جن میں یہ کلیہ یقیناً ٹھیک ہے جسم بےشک یا محترک ہوگا یا ساکن لیکن جسم ہی نہیں ہے تو حرکت یہ سکون کا ڈھونڈنا بلکل غلط ہے۔ اسی طرح رنگ اور شکل، یہ بھی جسم ہی سے متعلق ہے۔ جو چیز جسم نہ ہو اسے سفید یا سیاہ وغیرہ فرض کرنا صحیح نہیں ہوسکتا۔

قیاس بجائے خود صحیح بھی ہو تو جہاں فرق موجود ہو وہاں قیاس ہرگز صحیح نہیں ہے۔ دنیا کی سب چیزیں ایسی ہیں تو خدا کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے مگر یہ تمام چیزیں جس طرح کی ہیں اس طرح کا خدا ہو تو یہ تمام احکام اس پر جاری ہوں۔اور جب وہ حقیقت ہی ان تمام اشیاء سے مختلف ہو تو ان تمام احکام کے وہاں جاری کرنے کا کیا حق ہے۔ خدا کی ہستی کا ادراک قطعاً تجربہ و مشاہدہ استقرار و تمثیل کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ وہ انسان کے جوہر عقل سے متعلق ہے اور عقل انسانی ہی وہ ہے جو ایک لامحدود فضا میں پرواز کر سکتی ہے۔

اسی کے اوپر علم و فنون کی بنیاد ہے کیونکہ اصول و ضوابط اور کلیات کبھی حدود مشاہدہ میں اسیر نہیں ہوا کرتے ان علوم کو جانے دیجئے جو بالکل نظری ہیں۔وہ فنون و علوم جو احساس سے بالکل قریب ہیں اور ان میں غلطی نہیں ہوتی یا بہت کم واقع ہوتی ہے۔ وہاں بھی کلیات ہمیشہ مشاہدات کے آگے ہوتے ہیں مثلاً تین اور تین کا مجموعہ چھ۔ اس کو آپ کیسے سمجھے؟ کیا اس طرح کے تین آدمی اور تین آدمی شمار کیے چھ ہوئے۔ تین درخت اور تین درخت گنے چھ ہوئے۔ تین پتھر اور تین پتھر دیکھے چھ

ہوئے۔اس طرح کے دس بیس پچاس مشاہدات سے ہم سمجھے کے تین اور تین کا مجموعہ چھ ہوتا ہے۔ہرگز نہیں ورنہ میں کوئی چیز فرض کروں گا جس سے آپ نے شمار نہ کیا ہو اور کہوں گا کے ممکن ہے وہاں تین اور تین کا مجموعہ دس ہوجاتا ہو یہ مشاہدہ تو ایک محدود چیز ہے۔ اس سے آپ کو یہ کیسے معلوم ہوگیا کے ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ اور ہر جگہ مجموعہ اتنا ہی ہوگا۔ " ہمیشہ" اور " ہر جگہ" جہاں پر آیا مشاہدہ نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اور آپ کا علم و ادراک مشاہدہ سے آگے نکل گیا۔

فن ہندسہ میں یہ طے کیا گیا ہے کے ایک مثلث کے تینوں زاویے مل کر دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں۔ میں پوچھوں کیوں؟ آپ کہیں ہم نے ایک مثلث بنایا۔ اس کے زاویا کو بنایا۔اور قائمی تین کو ناپا تو وہ برابر ہووے۔ میں کہوں گا کے آپ نے کتنی دفعہ ناپا تھا؟ فرمائیں دس دفعہ۔ میں عرض کروں گا کے ممکن ہے گیارھویں دفعہ آپ ناپتے تو ایسا نہ ہوتا ۔ ہر ایسی فرد جو مشاہدے سے باہر ہے اس کے متعلق آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ اس پر بھی حکم لگادیں عقل جو کلیات جائے گی اس کے معنی یہ ہوں گے کے وہ مشاہدات حسیات سے بلند ہیں۔

ہمارے سابقہ زمانہ کے حکما نبض دیکھ کر بخار کی تشخیص کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں جب مشاہدہ کی قوت پر سب کچھ ہوتا ہے، تھرمامیٹر لگاتے ہیں۔ واقعی کیا یہ آنکھ سے دیکھ کر شناخت ہورہی ہے ؟ نہیں !جس اصول پر وہ مبنی تھا ۔ اسی پر یہ مبنی ہے ۔ وہ قوت لامسہ سے کام لیکر ایک کیفیت کا ادراک کرتے تھے۔ اور اس کیفیت سے بخار کا اندازہ کرتے تھے اسی بنا پر کے بخار میں اور اس طرح کی کیفیت میں تلازم سمجھتے تھے ۔

آپ نے قوت لامسہ کے بجائے باصرہ سے کام لیا ۔ سچ بتایئے تھرمامیٹر میں اس کا بخار ہے جو دکھلائی دے رہا ہے ؟ بخار تو بہرحال نادیدہ چیز ہے ۔ یہ پارہ ہے جو دکھائی دے رہا ہے مگر آپ نے یہ سمجھ

لیا ہے کے مقدار حرارت اور پارہ کی رفتار میں ایک خاص تلازم موجود ہے ۔ اس بنا پر آپ پارہ کی ترقی سے بخار کی زیادتی کا اندازہ کرتے ہیں۔وہاں بھی ذریعہ استدلال حتمی تھا۔ لیکن بنیاد استدلال عقلی تھی آپ کے یہاں بھی یہی صورت موجود ہے ۔ درحقیقت آپ کے سائنس کی بنیاد صرف اسی پر ہے کے آخر کو دیکھ کر موثر کا پتہ چلایا جائے ۔

قوت مشاہدہ آپ کی صرف آثار کے احساس میں کام کرتی ہے لیکن نتیجہ بہر حال غیر حتمی ہوتا ہے۔ پھر اہل مذہب جو استدلال آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ بھی تو یہی ہے۔ وہ یہ کبھی نہیں کہتے کے آنکھیں بند کرکے خدا کے وجود کا اقرار کرو ۔ وہ بھی آثار کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتے ہیں ۔ یہ آتا سب حستی ہیں ۔ عالم کائنات آنکھوں کے سامنے موجود ہے ان کو دیکھے اور پھر عقل سے موثر کا پتا لگایئے ۔ یہ بالکل وہی اصول ہے جو دنیا کے تمام نتائج میں جاری و ساری ہے مگر یہاں آپ کہتے ہیں کے اس موثر کو تو ہم نے دیکھا نہیں ۔

آخر ایک ان دیکھی چیز کو ہم تسلیم کس طرح کریں ۔ حالانکہ دیکھنے کا تعلق ہر چیز میں صرف آثار کے ساتھ ہے وہ یہاں بھی محسوس ہیں ۔بعض لوگ کہتے ہیں کے جب ہم علمائے مذہب سے خدا کے وجود کے متعلق دریافت کرتے ہیں بس وہ پورانے زمانہ کے اصطلاحات دور و تسلسل۔ علت و معلول ۔ واجب و ممکن وغیرہ پیش کرنا ۔شروع کر دیتے ہیں ۔ اس سے ہمارا دم گھبراتا ہے ۔ یہ حقیقت انسان کی کوتاہ نگاہ ہی ہے۔ یہ تو دنیا کی ہر چیز میں اصطلاحات مقرر ہوگئے ہیں۔

حقیقت ان اصطلاحات کی پابند نہیں ہوتی۔ایک لوہار کے پاس جایئے اس کے شعبہ عمل میں اس سے گفتگو کیجئے تو یہی آواز کان میں آئیگی۔ نہائی۔ ہتھوڑی۔ سوہان بڑھئی کے پاس جایئے۔ آری۔ بسولا۔اسی طرح کے نام اس کی زبان پر آئینگے۔ غرض ہر فن کے الفاظ ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت ان الفاظ کی

تابع نہیں ہوا کرتی۔اگر آپ کسی لفظ کو نہیں سمجھتے اس کے معنی سمجھ لیجئے۔ لفظ سے کیوں چڑھتے ہیں۔ اس حقیقت پر غور کیجیئے کے قابل قبول ہے یا نہیں۔ چونکہ عادت بڑی ہوئی ہے ان مطالب کو بیان کرنے میں اس طرح کے الفاظ کہنے کی اس لیے یہ الفاظ زبان پر جاری ہوتے ہیں۔ آپ اصل مطلب کو سمجھئے اور اگر ان الفاظ سے نفرت ہوتو دوسرے الفاظ وضع کر لیجیئے۔ ہم کو اس میں کوئی بحث نہیں ہے حقیقتاً یہ سب کاوش فکری سے بچنے کے بہانے ہیں جن کو حقیقت طلبی سے کوئی علاقہ نہیں ہے ۔ یہ پورے طور پر واضح ہوگیا ہے کے خدا کی معرفت جس حد تک کے انسانی دماغ سے متعلق ہے وہ ہرگز اس کے لیے غیر ممکن نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی ایسی دشواری ہے جس کا حل ہو ہی نہ سکتا ہو۔

☆☆☆☆☆

معرفت خدا کی ضرورت اور انسان کی عملی زندگی پر اس کا اثر

بعض لوگ کہتے ہیں کہ خدا کی معرفت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ " کوہ کندن وکاہ بر آوردن" ۔ اتنے مشکلات کو حل کیا دشوار گزار منزلیں طے کیں پھر ہوا کیا ؟ صرف یہ کے ایک ایسی ہستی کو جسے کبھی نہیں دیکھا سمجھ لیا کے وہ موجود ہے۔

پھر اس کے سمجھنے سے ہمارا فائدہ ؟ اور نہ سمجھتے تو ہمارا نقصان ؟ وہ کہتے ہیں" ہم" یہ نہیں کہتے کہ خدا کوئی چیز نہیں ہے ، ہو گا ۔ مگر ہمیں اس مسئلہ پر غور کرنے ہی کی ضرورت کیا ہے ۔ وہ ہے تو ہمارے نہ سمجھنے سے وہ معدوم ہو نہیں جائے گا ۔ وہ بہرحال موجود رہے گا ۔ رہ گیا ہماری زندگی کا نظام وہ ہمارے کردار سے متعلق ہے ۔ اس میں اعتقاد کو کوئی دخل نہیں ہے ۔

نئ دہلی کے جلسہ میں گزشتہ سال میرے لیے موضوع جو مقرر کیا گیا تھا وہ ایک شعر تھا:-

ہو گی نجات اس کی عمل جس کے نیک ہوں کافر ہو وہ عقیدہ میں یا دین دار ہو

کہنے والا اس سلسلہ میں یہ استدلال پیش کر سکتا ہے کہ خدا جس سے آپ کہتے ہیں وہ اگر ہماری آپ کی طرح نام و نمود کو پسند کرتا ہوتا یا جذبہ انتقام رکھتا ہوتا تو ضرورت تھی اپنے پروپیگنڈے کے لیے اس کو کے دنیا مجھ کو جانے مجھے پہچانے تب میں اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کروں۔ جیسے ہم میں ایسے تنگ نظر لوگ ہیں کہ کوئی حسن سلوک کرتے ہیں تو وہ چاہتے ہیں کہ ہر جگہ اس کا ڈھنڈھورا پیٹا جائے۔اور اس کی اشاعت ہو۔

اگر اتفاق سے ایسا موقع ہو کہ جس کے ساتھ ہم نے اچھائی کی ہے اس نے اس کا اظہار نہ کیا تو بس ہماری تیوریاں چڑھ گئ اور ممکن ہے اب ہم اپنے طرز عمل میں اس کے ساتھ تبدیلی کر دیں ۔خدا تو مستغنی ہے اس سے ان باتوں کی ضرورت نہیں ۔ وہ اگر کوئی حکم دے گا تو وہ بھی ہماری اچھائی کے لیے دے گا ۔ پھر ہم چونکہ مادی دنیا کے ہیں ۔ یہاں رہنے سہنے اور بسنے والے ہیں اس لیے جو ہماری اچھائی برائی ہو گی وہ ہماری اسی مادی دنیا سے متعلق ہو گی اس کا تعلق ہمارے افعال سے تو بیشک ہو سکتا ہے ۔

ممکن ہے ہمارا کوئی کام ایسا ہو جس سے ہم کو فائدہ پہنچے اور کوئی کام ایسا ہو جس سے نقصان پہنچے۔ اس لیے بالکل ٹھیک ہے کے ہمارے افعال پر پابندی عائد کی جائے جس سے ہماری زندگی کی اصلاح ہو سکے۔لیکن اعتقاد اس کا کے خدا ہے یا نہیں اس سے ہماری زندگی کی کون سی اصلاح ہو سکتی ہے اور اس کے نہ ماننے سے ہمارے لئے کون سی خرابی ہو سکتی ہے۔ اس لیے جو کچھ بھی نجات کا استحقاق ہے

وہ عمل سے متعلق ہے ۔ اعتقاد کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔یہ ہے نقطہ خیال ان لوگوں کا جو میں نے پیش کیا۔ اس کے جواب میں میں دو حیثیتوں سے گفتگو کروں گا۔

پہلے تو اس بنیاد پر کے اعتقاد عمل سے غیر متعلق چیز ہے لیکن خود اعتقاد کی کوئی ضرورت انسان کے لیے ہو سکتی ہے یا نہیں۔دوسرے یہ کہ حسن عمل کا کوئی تعلق اعتقاد سے ہے یا نہیں یہ دو نقطے بحث کے ہیں جن میں اگر میں کامیاب ہوا تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انسانی بہبودی کے لیے اعتقاد کی بھی ضرورت ہے۔

انسان اگر اپنی حقیقت کے لحاظ سے صرف یہی ہوتا جو آنکھوں سے دکھلائی دیتا ہے یعنی رنگ روپ شکل مقدار تو بس اسی حیثیت سے اس کی اچھائی ہو۔اسی حیثیت سے اس کی برائی اور اس صورت میں یہ خیال بھی کسی حدتک صحیح ہوسکتا تھا کہ انسانی ترقی اور کمال میں صرف افعال کو دخل ہے۔ لیکن اگر انسان اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہے جو باطن سے متعلق ہے تو اس انسان کی اچھائی اور برائی صرف اس کی جسمانی حیثیت سے وابستہ نہیں ہوسکتی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت دُنیا میں کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو انسان کی ترقی و تنزل اچھائی اور برائی کو صرف اس کی محسوس شکل و شمائل اور جسمانی حیثیت میں منحصر قرار دے ۔ اس کی جسمانی حیثیت کیا ہے؟ مثلاً وزن ۔ انسان کبھی موٹا ہوجاتا ہے اور کبھی دبلا وہ اس کے جسم کے اعتبار سے گرانقدری ہے اور یہ سب کی۔انسان کوٹھے پر چڑھ گیا اور نیچے آگیا۔ وہ اس کی جسمانی بلندی ہے اور یہ پستی۔ اس کی صورت جاذب نظر اور شکل دلفریب ہو یاخط و خال قابل نفرت ہوں ایسے کے دیکھ کر آنکھ بند کرلینے کو دل چاہیے وہ اس کی خوبی ہے اور یہ بدی ۔مگر کیا کسی ذیشعور طبقہ میں انسان کی گرانقدری اور سبکی۔ بلندی اور پستی ۔ خوبی اور بدی کا یہ مفہوم قرار دیا جائے گا ؟اس وقت "علم" "

علم" کی ہر طرف پکار ہے قوم کو ترقی کی ضرورت ہے۔ یہ علم سے کیا ہوتا ہے؟ اس سے کون سی ترقی حاصل ہوتی ہے؟ میں جسمانی حیثیت سے طلاب کی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے پستی ہی پستی نظر آتی ہے۔باریک کتابیں پڑھتے پڑھتے آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں۔ محنت کرتے کرتے چہرہ کا رنگ زرد ہوجاتا ہے۔ وسعت و پانحیف و لاغر ہوجاتے ہیں۔ بہت سے طالب علم ایسے ہیں کہ مشقت اٹھانے سے بیمار پڑ جاتے ہیں اور بعض تو دق میں مبتلا ہوکر دنیا ہی سے رخصت ہوجاتے ہیں ۔

اگر اس لڑکے کو عیش و عشرت میں مشغول چھوڑ دیا جاتا تو یقیناً اس کے جسم کی توانائی کا عالم ہی دوسرا ہوتا۔ لیکن علمی کدوکاوش کی وجہ سی اس کی طاقت مضمحل ہوگئ۔ اس کا وزن گھٹ گیا۔ پھر اس نے ترقی کیا کی؟ آپ فرمائینگے کہ نہیں یہ فلاں علم کے شعبہ میں بہت مشاق ہوگیا ہے ۔ یونیورسٹی میں اس کا مثل نہیں ہے۔ اس کو تمغے ملے ہیں۔ اور انعامات عطا ہوئے ہیں ۔ اس نے بہت نمایاں ترقی حاصل کی ہے۔میں کہوں گا کہ آخر اس میں کس چیز کی ترقی ہوئی۔

ہاتھ پیروں کی تو ترقی نہیں ہوئی۔ آپ فرمائینگے نہیں اس کے دماغ کی ترقی ہوئی تو اس کا کیا مطلب۔ دماغ کی بھی جسمانی حیثیت یعنی سر اس کا چھوٹا تھا اب بڑا ہوگیا۔ دماغ میں سوراخ کم تھے اب زیادہ ہوگئے۔ مگر نہیں یہ ادراکات کی ترقی ہے جسے آپ انسان کی ترقی سمجھتے ہیں۔اور اس کی ترقی خود ایک مستقل ترقی ہے جو انسان کے لیے بہت بیش قرار چیز ہے پھر ادراکات مختلف ہوتے ہیں۔ان میں درجے قائم ہیں۔کوئی انسان کے لئے زیادہ بلند ہے اور کوئی کم۔

ایک بڑھئی کو اپنے شعبہ کے متعلق معلومات حاصل ہیں اور ایک لوہار کو اپنے شعبے کے متعلق۔ ایک سنار کو اپنے شعبے میں ۔ اور ایک تاریخ و ادب کے پروفیسر کو اپنے مخصوص شعبہ میں یقیناً وہ معلومات جو بڑھئ لوہار یا سنار کو اپنے اپنے فن کے متعلق ہیں وہ ان پروفیسر صاحب کو حاصل نہیں ہیں۔ جس

طرح ان کے معلومات ان کے ساتھ مخصوص ہیں اور وہ دوسرے ان سے جاہل ہیں اس لئے ان سب کو مساوی حیثیت حاصل ہونا چاہیئے۔ مگر عقلائے زمانہ ان میں تفریق قائم کرتے ہیں۔ وہ لوہار سے سنار کے درجہ کو بلند قرار دیتے ہیں۔ اور ان تمام لوگوں سے پروفیسر صاحب کے مرتبہ کو بالا تر سمجھتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے؟ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادراک کی بلندی اور اس کے درجہ کی رفعت اپنے متعلق کے اعتبار سے ہے یعنی وہ شئے جس کا ادراک ہورہا ہے جتنی بلند ہوگی اتنی ہی بلندی اس ادراک میں پیدا ہوگی اور اتنا کمال انسانی کا جوہر اس میں زیادہ مضمر ہوگا۔

سنار کا فن چونکہ سونے سے متعلق ہے اور لوہار کا کام لوہے سے اور خود سونا قدرو قیمت میں لوہے سے زیادہ ہے اس لیے سناری کا پیشہ بھی لوہار کے پیشہ سے رفیع المرتبت ہوگیا پھر چونکہ ایک پروفیسر کے معلومات کا تعلق بلند موضوعات سے ہے اس لئے اس کا علم ان سب سے بلند ہوا۔

اس اصول پر یقیناً اگر خدا کوئی چیز ہے تو اس کی ہستی ہر موجود دکائنات سے بلندوبالاتر ہے۔ یہاں تک کے اس کی ہم پلہ کوئی چیز نہیں ہے۔ اور اس لحاظ سے انسانی دماغ کی انتہائی کامیابی اور بلندی ہوگی اس کے متعلق معلومات کے ادراک حاصل کرنے میں جو خدا شناسی کی منزل ہے اور جسے " معرفت " کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اب اس میں آپ کو کسی مادی منفعت کی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے نہ جسمانی فائدہ کی جستجو کا موقع ہے۔ بلکہ خود یہ علم و معرفت ہی ہزار فائدوں سے بڑھ کر ایک فائدہ ہے جو انسان کے لیے بلندی و رفعت کا سبب ہے۔

پھر نجات جس چیز کا نام ہے۔ جس کا تذکرہ اس شعر میں کیا گیا ہے جو میں نے اس بحث کے شروع میں پیش کیا۔ ہوگی نجات اس کی عمل جس کے نیک ہوں۔اس کا تعلق اگر صرف جسمانی بہبودی کے ساتھ ہوتو یہ سمجھنا ممکن بھی ہے کہ وہ صرف افعال پر موقوف ہے لیکن اس عالم کے احکام کا تعلق

انسان کی صرف ظاہری حیثیت کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اس باطنی حیثیت کے ساتھ ہے جس کو عقل دماغ یاقوت ادراک کہتے ہیں ۔اس لئے دیوانہ تکلیف سے مستثنیٰ کردیا گیا حالانکہ ممکن ہے اس کی جسمانی طاقت صحیح انسانوں سے زیادہ ہو۔ اس کے خط وخال بھی بہت اچھے ہوں مگر اس میں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا نجات یا عدم نجات کا کیونکہ وہ اس میدان ہی میں نہیں ہے جس کے اندر یہ مقابلہ ہورہا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ نجات کا تعلق انسان کی ظاہری جسمانی حیثیت کے ساتھ نہیں ہے۔شاید یہی وجہ ہے جو کہا گیا ہے کہ

"الْعَمَالُ بِالنيَاتِ وَإِنَمَا لِيُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ مَا نَوَى لَه"۔

عمل تو کسی کام کی مادی حیثیت ہے۔ اور نیت اس تعلق کا نام ہے جو انسانی دماغ کے ساتھ ہے۔ اگر عمل کی ظاہری صورت مکمل ہو مگر اس کا تعلق انسان کے دل و دماغ کے ساتھ مکمل طور پر نہ ہوتو عمل کوئی چیز نہیں ہے ۔انسان کا تخیل و تصور بہت سی چیزوں میں واقفیت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے ایک ایسا راستہ جس پر عموماً لوگ تفریح کے لئے جایا کرتے ہیں۔ جیسے ٹھنڈی سڑک۔ اس سے ان کے مزاج میں انبساط پیدا ہوتا ہے۔

لیکن وہی راستہ اگر مشغولیت کے طور پر کسی فرض کی انجام دہی کے سلسلہ میں طے کیا جائے تو وہ فائدہ اس سے نہیں مترتب ہوتا جو سیر و تفریح سے ہوگا۔وقت وہی تیسرے پہر کا۔ جگہ وہی ٹھنڈی سڑک۔ مگر چونکہ احساس یہ ہے کہ میں کام کو جارہا ہوں۔ تفریح کا تخیل دماغ میں نہیں اس لیے فرحت کا اثر بھی مترتب نہیں ہے۔یہی صورت سمجھ لیجئے نیت کی۔ وہ اٹھا بیٹھی نماز کی۔ وہ دوڑ دھوپ حج کی۔ اگر اس کا تخیل نہیں کہ ہم کس کے حکم کی انجام دہی میں مصروف ہیں تو اس کا نتیجہ وہ نہیں ہوسکتا جو اس عبادت کا اصلی منشا ہے۔ یہ چیز حقیقتاً دماغ سے متعلق ہے اور یہی وہ چیز ہے جس

کے لحاظ سے عمل میں وزن پیدا ہوتا ہے ۔یہ اور بات ہے کہ ہم سے جو کہا گیا کہ میزان اعمال نصب ہوگی۔ تو چونکہ ہم اس مادی فضا میں پرورش پائے ہوئے ہیں ہم نے سمجھ لیا کہ وہ اسی طرح کی کوئی بڑی ترازو ہوگی جس کے دو پلڑے ہونگے ان کے درمیان لمبی سی ڈنڈی لگی ہوگی۔ کوئی فرشتہ اس کو پکڑے ہوئے ہوگا۔ اعمال ڈھو ڈھو کر لائے جارہے ہونگے اور تولے جائیں گے۔ یہ تصور ہمارے ذہن نے پیدا کیا ہے۔

حالانکہ میزان کے معنی ہیں جانچنے کا ذریعہ جس طرح کی چیز ہوتی ہے ویسی ہی اس کی ترازو ہوتی ہے۔ لکڑی کے لیے اس طرح کی ترازو جو ٹھیکیوں پر آپ نے دیکھی ہے۔ سونا تولنے کے لیے وہ کانٹا جو سناروں کے یہاں ہوتا ہے۔ شعر کے جانچنے کے لیے میزان ہے۔ وہ علم عروض جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کون شعر پورا ہے اور کون کم زیادہ ۔اور عقلی نتائج کے لئے وہ استدلال کے معیار جو علم منطق میں مذکور ہیں۔ اسی لئے منطق کا نام " علم المیزان " قرار پایا۔

اس طرح اعمال کو سمجھ لیجئے۔ اگر وہ کوئی مادی جسم رکھتے ہوتے جیسے لوہا۔سونا۔چاندی وغیرہ تو اس کی میزان اس طرح کی ہوتی لیکن جبکہ ایسا نہیں ہے تو میزان عمل بس وہ معیار ہے جس سے عمل کے ناقص اور کامل ہونے کا پتہ چل جائے۔یہ صرف مقدار کا تولنا نہیں ہے بلکہ کیفیت کا بھی تولنا ہے۔ دنیا میں یہ جانچ نہیں ہو سکتی۔ یہاں حجاب ہیں۔ یہ عالم ظاہر ہے اور ظاہر ہی پر یہاں نتائج مترتب ہوتے ہیں ۔ لیکن وہاں انسانیت کی جانچ ہوتی ہے جو ان پردوں کے اندر مضمر ہے۔

انسانی معارف و ادراکات ہی وہ ہیں جو اس انسان کی بلندی کا ذریعہ ہیں۔ اور انہی سے نجات کا تعلق ہے ۔ پھر یہ خیال کیسے صحیح ہوسکتا ہے کے نجات میں عقیدہ کو کوئی دخل نہیں ہے ۔اب دوسری

حیثیت سے ملاحظہ فرمایئے کہ نجات اس کی ہو گی جس کے عمل نیک ہوں لیکن عمل کے نیک ہونے کا کیا معیار ہے؟ کیسے ہم سمجھیں کہ یہ عمل نیک ہے اور یہ عمل بد ہے۔اگر دنیا نیکی و بدی کے حدود کے تعین میں کسی ایک نقطہ پر مجتمع ہو جاتی تو یہ سمجھنا آساں تھا کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے۔ لیکن جس وقت میں ہم اہل عالم کے طبائع ۔ آرا و خیالات کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نیکی وبدی کے مسئلہ کو دنیا پورے طور پر طے نہیں کر سکی ہے ۔

آپ ممکن ہے میرے سامنے بعض باتیں پیش کر دیں کہ یہ سب کے نزدیک اچھی ہیں ۔ مثلاً سچ بولنا۔ امانت داری سے کام لینا۔لیکن اگر ذرا آپ میرے ساتھ چلیں تو میں آپ کو بعض ایسے چوراہوں پر لیجاکر کھڑا کر دونگا جہاں آپ حیران ہونگے کہ نیکی کا راستہ کون سا ہے۔سچ بولنا اچھا ہے مگر ایک شخص تلوار لے کر آتا ہے اور ایک بے گناہ کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ وہ بے چارہ مخفی ہوجاتا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں اور اس کے جائے پناہ سے واقف ہیں۔ ظالم آتا ہے ادھر ادھر دیکھتا ہے ہم سے پوچھتا ہے تم نے فلاں شخص کو دیکھا ہے؟ تم کو معلوم ہے وہ کہاں گیا ہے ؟ اب فرمائیں سچ بولا جائے ؟ یہاں پر کہہ دیجیئے کے ہاں مجھے معلوم ہے وہ اس جگہ پر چھپا ہوا ہے اگر آپ نے کہہ دیا تو معلوم ہے کہ اس کی گردن ہوگی اور ظالم کی تلوار ۔

بےشک عقلائے عالم اس جگہ پر فیصلہ نہیں کر پاسکتے کے سچ بولنا مستحسن ہے۔ امانت کا واپس کرنا اس کے مالک کی طرف بہرحال مستحسن ہے ؟ اتفاق سے اسی ظالم نے اپنی تلوار آپ کے پاس رکھ امانت رکھ چھوڑی تھی اس وقت وہ اپنی امانت کو مانگ رہا ہے مگر آپ جانتے ہیں کہ اس تلوار کو لیکر وہ اس مظلوم کو قتل ہی کریگا۔ اس وقت ہرگز نہیں۔کہا جاسکتا کہ اس امانت کا دینا عقلا مستحسن ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی ہے جس میں کلیۃً عقلائے عالم کسی نقطہ پر مجتمع ہو گئے ہیں آپ کہیں گے کہ دنیا میں

اکثریت جس چیز کو صحیح سمجھ لے وہ صحیح ہے یہی ہوا ہے جو چلی ہوئی ہے ۔ مگر کیا عالم میں جمہوریت کے لیے کوئی منضبط نظام ہے کہ وہ ہمیشہ ایک ہی نقطہ پر برقرار رہے ہم تو جس وقت دنیا میں شروع سے آخر تک عالم انسانیت میں معیار عمل کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کے اکثریت اور اقلیت ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آتی جاتی رہی ہے۔ ایک وقت میں جس چیز پر جمہور مجتمع تھی دوسرے وقت اس کے خلاف پر مجتمع ہوگئی۔ مثلاً ایک وقت دنیا شہنشاہیت کو پسند کرتی تھی۔

اس کے بعد ایک دور ایسا آیا جس میں لوگ کہنے لگے کے جمہوریت اچھی ہے شہنشاہیت کو مٹا دینا چاہئے ۔ مگر کیا دنیا اس بات پر برقرار رہی؟ ایسا نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ برابر انقلابات ہورہے ہیں۔ وہی قدم جو آگے بڑھے تھے پیچھے ہٹا لیے گئے ہیں۔وہ مقامات جہاں جمہوریت قائم ہوچکی تھی اب جمہوریت ہٹکر اب وہاں شخصی سلطنت قائم ہورہی ہے۔ جس طرح وہ خود مختار حکمران جو دنیا پر اپنے طاقت و اقتدار کا دباؤ ڈالتے ہیں خطرہ میں رہتے ہیں اسی طرح روس کے قائد اعظم کے خلاف بھی برابر سازشیں ہوتی رہتی ہیں اور دنیا اس کی ہستی سے بھی اپنے ورق کو بھی پاک کرنا چاہتی ہےمعلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی پیاس کسی طرح بجھتی نہیں ۔

کبھی ایک مختتم نتیجہ پر پہنچ کر دنیا ٹھر جائے ۔ کہ بس اب یہ نقطہ حقیقت ہے ۔ ایسا کبھی نہیں ہے۔

پھر جس وقت میں یہ اقلیت اور اکثریت تبدیل ہوتی رہتی ہے تو ہم اس کو معیار حقانیت کیسے قرار دے لیں۔ کیونکہ حقیقت تو وہ چیز ہوتی ہے جو ناقابل تبدیل ہو۔ یہی اشتراکیت ، جو اس وقت ایک ہمہ گیر سوال کی صورت میں بن گئی ہے ۔ اس کے متعلق عالم کے نقطہ نظر میں کس قدر انقلاب ہوا ہے ۔ایک وہ زمانہ تھا جب ہر ایک کے دماغ میں سرمایہ داری بسی ہوئی تھی ۔ اموال میں ملکیت و وراثت کا اصول کار فرما تھا ۔ اب یہ دور آگیا ہے کے دنیا والے کہنے لگے ۔ نہیں یہ دنیا کی پیداوار

سب کی ملکیت ہونا چاہیے ۔ کسی ایک کا بھی کوئی خصوصی حق نہیں ہے ۔زمین مشترک ۔ اس کی پیداوار مشترک ۔ اس لئے ہر ایک شخص بقدر ضرورت منتفع ہو۔ پھر ان متضاد نظریوں میں صرف اقلیت و اکثریت کی بناء پر ہم یہ کیسے سمجھیں کہ کون سا نظریہ واقعا صحیح ہے پھر کیا یہ کہہ دیا جائے کے جس کی جو سمجھ میں آئے اس کے لیے وہ نیک ہے ۔

اس کے لئے کوئی عمومی معیار نہیں ہے ۔ بے شک اگر افراد انسانی الگ الگ زندگی گزار سکتے تو آپ کا یہ تصفیہ صلح کل حیثیت رکھتا تھا ۔ اور یہ مان لیا جاتا کہ جو شخص جو طریقہ کار بہتر سمجھے اس کے لیے وہی صحیح ہے ۔ لیکن جبکہ یہ تمام افراد اپنی فطرت اور اس کے ضروریات کی بناء پر اتحاد عمل کے محتاج ہیں اور متحدہ حیثیت سے زندگی گزارنے کی ضرورت ہے تو آپ ان میں سے ہر فرد کو مطلق العنان کیسے بنا سکتے ہیں؟

اس صورت میں بہت سے لوگ اپنی ذاتی خواہشوں کی بناء پر کچھ چیزوں کو اختیار کرینگے اور جب آپ اعتراض کرینگے تو وہ کہہ دیں گے جو جس کا خیال ہے وہ اس کے لیے صحیح ۔ اس وقت میں یہ افراد انسانی ایک مجموعی نظام میں منسلک ہی نہیں ہوسکتے۔ ہر فرد عالم جدا ہوگی اور چونکہ انسان انفرادی حیثیت سے زندگی نہیں گزار سکتا اس لئے دنیا فنا ہو جائے گی ۔ تو پھر ضرورت کس بات کی ہے؟ہم ان تمام مختلف آراؤ افکار میں خواہ مخواہ کہدیں کہ تمھارا طریقہ کار صحیح ہے اور تمھارا غلط۔ اس کا ہمیں حق کیا ہے جبکہ ہم کو ان پر کوئی تفوق نہیں ہے ۔

ہم بھی ان ہی کی طرح انسان ہیں ۔ کوئی صحیح طریقہ کار اس عالم انسانیت کو ایک راستے پر متحد العمل تو کرے چلنے کا قرار ہی نہیں دیا جاسکتا جب تک ان سب پر ایک بالادست طاقت کو فرض کرتے ہوئے اس کے فیصلہ کو ان سب پر کارگزار نہ کر دیجیئے اور سب کو اس کا پابند بنائے۔

اب ان سب کے ذاتی خیالات و آراؤ افکار باہم دیگر کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں مگر جب یہ تمام آراؤ خیالات اس بالادست قوت کے سامنے آئیں جو ان سب پر ہے تو محو ہو جائیں۔یہی قوت جو ایک بالادست ہستی کے سامنے تمام انفرادی آرا کو فنا کردے اسی کا نام ہے "مذہب"اور اس کے احکام کے مجموعہ کا نام ہے شریعت۔ اگر آپ نے شریعت خداوندی کو تسلیم کرلیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس دنیا میں ایک نظام اجتماعی مقرر کرسکتے ہیں۔

کیونکہ اس قانون کا انتساب اس ہستی کی طرف ہے جو سب سے مافوق ہے۔ میں اگر اس مختلف انخیال مجمع میں کہوں کہ آپ کی رائے غلط اور آپ کی ہے صحیح تو مجھے کہنے کا حق کیا۔ بہت سے لوگ مقابلہ کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ لیکن اگر ایک ایسی ہستی مسلم ہو گئی جس کی نسبت ان تمام افراد کو بندگی کی حیثیت حاصل ہو تو اس کا نافذ کردہ قانون چاہیے کسی کی طبیعت پر بار ہو۔ چاہے کسی کی عقل میں نہ آئے چاہے کوئی کہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر چونکہ نافذ کیا ہوا اس کا ہے جو ہم پر حکمران ہوئے کا استحقاق رکھتا ہے اس لیے اطاعت اس کی سب پر فرض ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ سلطنت کی مجلس قانون ساز کے ارکان جو قانون بناتے ہیں اس کے ہر ہر جزو کے رموز اور مصالح پر رعیت کے تمام افراد مطلع نہیں ہوتے اور نہ اس کے ہر جزو سے متفق ہوتے ہیں بلکہ بہت سے ان میں سے ایسے ہوتے ہیں جو اس کی مصلحت کو نہیں سمجھ سکتے اور اگر ان قوانین کے ہر پہلو کو ہر شخص بتا سکتا تو یہ سب اتنے ہی بڑے ماہر قانون قرار پاتے جتنے کے مجلس مقننہ کے ارکان ہیں۔ لیکن جب یہ مسلم ہے کہ ان کا قانونی دماغ ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے تو ہمارے لیے یہ یقینی طور پر کہا بھی نہیں جاسکتا کے ہم ان کے بنائے ہوئے قانون کے تمام پہلوؤں کو اپنی عقل سے سمجھ سکتے ہیں ۔لیکن پھر بھی اس قانون پر عمل کرنا سب پر لازم ہے۔

اس لئے کہ مصلحت فہمی دوسری چیز اور اطاعت دوسری چیز۔ ہم نہ سمجھیں ان کے قانون کی مصلحت کو لیکن چونکہ ہم ان کی حکومت کے اندر داخل ہیں۔ اس لئے ہم کو اس قانون پر بہرحال عمل کرنا ہوگا۔ پھر یہ تو ایک عارضی اقتدار ہے جو بالکل ظاہری حیثیت رکھتا ہے اور محدود بھی ہے۔ اس کو خالق کی عظمت سے کیا نسبت۔ اب اگر اس تمام عالم انسانیت کے لئے ایک خالق کا وجود مان لیا گیا جس کی دانائی و حکمت بھی اس کے کمال ذاتی میں مضمر ہے تو اس کے نافذ کردہ قانون کے متعلق ہمیں یہ تو کبھی توقع ہی نہیں کرنا چاہیے کہ ہم اس کے تمام مصالح و رموز کو سمجھ سکیں گے جبکہ ہمارا جہل تسلیم شدہ ہے اور اس کا علم۔

ہماری احتیاج تسلیم شدہ اور اس کا استغنا۔ پھر ہم کو یہ حق کہاں سے پہنچ سکتا ہے کہ یہ حکم کیوں؟ اور وہ حکم کیوں؟ ہم کو تو اس حکم کو ماننا ہے اس لئے کہ اس کا حکم ہے۔ مصلحتیں اس میں ہوں گی اور ممکن ہے ہزاروں ہوں لیکن ہم ان مصلحتوں کو سمجھ لیں۔ یہ کس طرح ضروری قرار پاسکتا ہے؟

اب آپس میں ذاتی آراؤ خیالات میں لاکھوں بھی اختلافات ہوں مگر راہ عمل میں سب متحد و یکساں ہونگے۔ اس لئے کہ ان کا محرک صرف ایک ہے۔ اور وہ اس مالک کی عبودیت جو ان سب کے ساتھ مشترک اور یکساں تعلق رکھتا ہے۔

آیئے تمام عالم کو ہم اس کی تلقین کرتے ہیں کہ نجات اس کی ہوگی جس کے عمل نیک ہوں۔ لیکن تمام عالم کے لئے مشترک "نیک عمل" کے حدود متعین ہی نہیں ہوتے جب تک ایک متحد نظام کے تحت میں اس کو نہ لائیں اور وہ بغیر " اعتقاد" کے ممکن نہیں ۔آپ فرمائینگے کہ ہم دیکھتے ہیں دنیا میں قوانین بنتے ہیں اور ان پر کامیابی کے ساتھ عمل بھی ہوتا ہے حالانکہ وہاں مذہب کا کوئی دخل نہیں ہے ۔میں افسوس کے ساتھ کہوں گا کہ یہ خیال درست نہیں ہے۔ اول تو جہاں تک دیکھا جاتا ہے

سلطنتی قوانین نے خود مذہبی شریعتوں کے اصول سے مدد حاصل کی ہے لیکن اس کو جانے دیجئے۔ مخالف اس کو تسلیم نہیں کرے گا۔یہ ملاحظ کیجئے کہ سلطنتی قوانین کی بنیاد ظاہری طاقت و جبروت پر ہے۔ اس لئے وہ صرف مادی زور و اقتدار کے سہارے پر دنیا میں چلتے ہیں یعنی خود انسانی ضمیر ان کا پابند نہیں ہوتا۔

اس کا نتیجہ ہے کہ ادھر ذرا اقتدار کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور سلطنت کی بنیاد میں تزلزل پیدا ہوا ادھر دنیا نے اس جوے کو اتار پھینکنے کی کوشش کی جو زبردستی اس کی گردن پر رکھ دیا گیا ہے ۔اور اگر سلطنت کی طاقت مستحکم ہے جب بھی اتفاق سے ایسی صورتیں پیدا ہو جائیں کہ مادی ذرائع انسان کو سزایاب بنانے سے قاصر ہوں جس طرح ایسا موقع جب کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔جاسوس و مخبر کا اندیشہ نہ ہوتو ایسے وقت میں کوئی چیز نہیں ہے جو انسان کو احترام قانون پر مجبور کرے لیکن مذہبی قانون وہ خود انسان کے نفس میں انسان پر نگراں مقرر کردیتا ہے۔

یعنی ضمیر انسانی خود اس کے عمل کا محتسب بن جاتا ہے۔ اس لیے چاہے کوئی خبر رساں نہ موجود ہو۔لیکن ضمیر کی طاقت خود انسان کو احترام قانون پر مجبور کرتی ہے اور یہ اسی دوسرے جز و نتیجہ ہے جس کا نام ہے" اعتقاد"۔

اس کا نتیجہ ہے کہ مذہبی جذبہ کبھی دنیوی اقتدار سے دیتا نہیں مجھے اس قسم کی مثالیں یہاں پر پیش کرنا نہیں ہیں۔ تاریخ کے اوراق سے پوچھ لیجیے۔ دنیاوی اختیارات نے مذہب کی مخالف میں کیسے کیسے تشدد سے کام لیا ۔اگر مذہبی احساس بھی کسی مادی جذبہ پر مبنی ہوتا تو مذہب کب کا فنا ہوگیا ہوتا۔ مگر چونکہ ایسا نہ تھا اس لئے اگر سلطنت کے اقتدار سے مذہب دب بھی جائے تو ویسا ہوگا جیسے راکھ کے پردہ میں چھپی ہوئی چنگاری۔ ادھر یہ پردے ہٹے اور ادھر چنگاری نمایاں ہوئی۔ اس لئے دنیاوی اقتدار

شکست کھاتا رہا مذہبی جذبہ کے مقابلہ میں۔ کیونکہ وہ مبنی تھا ظاہری اسباب پر اور وہ ہیں عارضی اور یہ مبنی ہے قلبی احساس پر جو مستقل اور دیرپا حیثیت رکھتا ہے۔بے شک دنیا کی سلطنتیں ہاتھ پیروں پر حکومت قائم کرسکتی ہیں۔ لیکن دلوں پر حکومت نہیں کرسکتیں اور دل پر جو حکومت کرتا ہے وہ مذہب ہی ہےمعلوم ہوا کہ اگر دنیا کو حقیقی معنوں میں"نیک عمل " کا پابند بنانا ہے تو ایسے مذہب ہی کی تلاش کیجئے جو نیک عمل کی طرف دعوت دیتا ہو۔وہ اعتقادات ہی اس انسان کے عملی استحکام کے ضامن ہونگے ۔لیکن اگر عمل کو اعتقاد سے الگ کر لیاجائے گا تو ان کی عمارت بالو کی زمین پر بلند ہوگی جس کا ذرا سے میں بیٹھ جانا لازمی ہے۔

نجات کا اگر نیک عمل ہی سے تعلق ہے تو بھی اس حسن عمل کا ذریعہ صرف اعتقاد ہے۔بے شک اس امر کے دیکھنے کی ضرورت ہوگی کہ اعتقادات کون سے نقطہ حقیقت کے مطابق ہیں۔ کیونکہ دنیا میں تخیلات کی کثرت ہے۔ حق و باطل میں آمیزش ہے اور اس لئے مذاہب کی تعداد میں کثرت پیدا ہوگئی ہے۔مذہب کے خلاف ایک یہ چیز بھی ہے جو بطور اعتراض پیش کی جاتی ہے کے جناب !اگر مذہب ایک ہوتا تو خیر آسانی کے ساتھ مان بھی لیتے مگر مذہب تو دنیا میں بہت ہوگئے ہیں۔ اب کس کو مانا جائے اور کس کا نہ مانا جائے۔ اس لئے ہماری نجات اسی میں ہے کہ اب ان سب کو خیرباد کہیں اور اس جھگڑے ہی میں نہ پڑیں۔

مگر یہ انسان کی دماغی کاہلی ہے اس کو حقیقت طلبی سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ آپ کو اگر کسی جگہ جانا ہے اور راستہ میں چوراہا مل جائے تو کیا اس جگہ سے پلٹ آنا چاہیے کہ معلوم نہیں ہمارا راستہ کون ہے؟نہیں بلکہ تحقیق کرنا چاہیے ۔ پوچھنا چاہیے۔ قرائن سے مدد حاصل کرنا چاہئے اور اس طرف چلنا چاہئے جدھر اطمینان ہو جائے کہ یہ وہ راستہ ہے جو ہماری منزل تک پہنچائے گا۔

دنیا کی کون سی چیز ایسی ہے جس میں سب ایک نقطہ پر مجتمع ہوں۔ کھانا کوئی کچھ کھاتا ہے کوئی کچھ تو پھر کھانے سے باز آیئے کہ کون اس جھگڑے میں پڑے۔اسی طرح لباس۔ طرز سکونت وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح اگر دنیا میں اختلافات نے مذہب کے راستے کو جدا جدا بنا دیا ہے تو آپ سوچیئے سمجھئے عقل و فکر سے کام لیجئے اور اسے اختیار کیجئے جو آپ کی سمجھ میں آئے کہ یہ حقیقی مذہب ہے۔ جو انسانی ترقی و بہبودی کا علمدار ہے۔ یہ نہ ہوکے غور وفکر کی محنت سے بچنے کے لیے اپنے نیتیں اس راستے سے خود دور کردیں جو نقطہ حقیقت تک لے جانے والا ہے۔انسان کو عقل و دماغ کی طاقتیں اس لیے دی گئی ہیں کہ وہ سوچے اور سمجھے۔ اگر متضاد راستے سامنے نہ ہوتے تو پھر دماغ کو کاوش فکری سے دو چار ہی کہاں ہونا پڑتا۔

☆☆☆☆☆

معرفت خدا کا عملی نتیجہ

یہ خدا کی معرفت یعنی اس خالق کل کو پہچانا جس کی طرف اہل مذہب دعوت دیتے ہیں خود انسانیت کو ایک نقطہ واحد پر لانے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔دنیا میں ہر جگہ آپ کو افتراق نظر آئے گا کوئی ایک ملک کا باشندہ کوئی دوسرے کا کوئی تیسرے کا رہنے والا کوئی مغرب کا۔

کوئی کالا کوئی گورا کوئی ایک خاندان کا کوئی دوسرے خاندان کا۔ کوئی مالدار کوئی فقیر کوئی توانا کوئی ناتوان یہ سب افتراق نظر آئے گا۔ان کی وجہ سے دنیا ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ ہر ایک دوسرے کو ذلت کی نگاہ سے دیکھنے لگا ۔ ہرایک طبقہ دوسرے طبقہ سے اجنبیت کا اظہار کرنے لگا۔ان میں کسی مشترک نقطہ کا احساس نہیں ہے۔ لیکن یہ خدا کا مان لینا کہ حقیقتاً ایک خالق ہے جس کے سب بندے

ہیں۔ایک واحد چیز ہے جو اس تمام عالم انسانیت کو ایک نظام میں منسلک کر دیتی ہے۔ یعنی تمام افراد عالم میں ایک رشتہ داری پیدا کر دیتی ہے۔رشتہ داری کے کیا معنی ہیں؟ صرف کسی ایک شخص کی طرف چند آدمیوں کا مشترک انتساب اسی کو قرابت کہتے ہیں جس کی وجہ سے یگانگی پیدا ہوتی ہے۔اگر تمام دنیا کو یہ باور کرانے میں کامیابی ہوگئ کہ ہم سب ایک خدا کے بندے ہیں اور ہم سب کا خالق ایک ہے تو پھر دنیا میں ہزاروں افتراق سہی مگر یہ ایک رشتہ ان سب پر حاوی ہے۔اس احساس کا نتیجہ کیا ہے؟ اس سے تبادلہ حقوق اور مساوات باہمی کا خیال پیدا ہوتا ہے جس طرح ایک باپ کی اولاد۔ ایک ماں کے بچے۔ ایک خاندان کے افراد۔ ایک ملک کے باشندے ادھر ایک کا لفظ آیا اور برابری کا تخیل پیدا ہوا۔

اور اسی پر مساوات اور تبادلہ حقوق کی بنیاد قائم ہے۔یہ دنیا والے کیوں ایک دوسرے کو ذلیل نگاہوں سے دیکھتے ہیں؟ یہ کیوں گورے کالوں کو اپنے ساتھ ہوٹل میں کھانا نہیں کھانے دیتے۔یہ اس کا نتیجہ ہے کہ ان کو یہ احساس نہیں ہے کہ جو ان کا خالق ہے وہی ہمارا بھی خالق ہے ۔ اگر یہ احساس پیدا ہو جائے تو وہ سمجھیں گے کہ یہ تو رنگ ساز کا کام تھا جو رنگ بدل دیا۔اس سے وہ ذلت کا مستحق تھوڑی ہوگیا۔ پھر چونکہ دنیا میں افتراق قائم ہے۔ کوئی قوی ہے کوئی کمزور۔

اس قوت اور ضعیف کی بھی حیثیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ جسمانی توانائی کے لحاظ سے۔ مال و دولت کے لحاظ سے عقل و تدبر اور حیلہ گری و سیاست کے لحاظ سے اور یہ تمام مختلف اشخاص ضروریات دنیا کی احتیاج میں مشترک ہیں۔وہ جو ہمارے نزدیک غنی ہیں وہ سب سے زیادہ محتاج ہیں کیونکہ احتیاج کے معنی ہیں ضرورت مند ہونا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایک بادشاہ کو اپنی سلطنت کے سنبھالنے میں جتنی

چیزوں کی ضرورت ہے اتنی ایک فقیر کو ضرورت نہیں ہے ۔اب ان تمام ضرورت مند اشخاص میں ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنی ضروریات زیادہ سے زیادہ حاصل کرلیں۔ دوسروں کو اپنے مقابلہ میں ناقابل لحاظ سمجھتے ہیں اس لئے ان کے حقوق غصب کرنا چاہتے ہیں۔

اور جس طرح کے جزبات ان کے دلوں میں موجود ہیں اسی طرح کے نظریہ بھی بناتے ہیں۔

یہ چیز کے طاقتور کمزور کو فنا کردے دنیا میں نظریہ کی شکل میں آگئی ان الفاظ میں کہ تنازع للبقاء کی ضرورت ہے۔یہ خیال مادی اصول سے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن اس مقابلہ میں کہ ہر طاقتور انسان کمزور کو فنا کر دینا چاہے۔ کیا یہ دنیا آباد رہے گی؟ غیر ممکن ہے۔ کیونکہ طاقت اور کمزوری اگر ایک مستقل اور پائدار چیز ہوتی تو پھر بھی ہم مان لیتے کہ ایک دفعہ جنگ ہوکر جو طاقتور ہو وہ ہمیشہ کے لیے رہ جائے اور جو کمزور ہو وہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے۔

مگر یہ طاقت اور کمزوری تو ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ ایک وقت میں جو طاقتور ہے دوسرے وقت میں وہی کمزور ہوتا ہے اور جو کمزور ہے اس کو طاقت حاصل ہوتی ہے ۔مثال کے طور پر مانا میں نے کہ آج یہ جوان ہے اور وہ کمزور بچہ۔یہ ناحق اس کو مارے گا اور وہ برداشت کر لے گا۔ اس لئے کہ یہ طاقتور ہے۔ وہ اس کے مقابلہ میں بےبس مگر ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ جوان بوڑھا ہوگا اور وہ بچہ جواں۔اس وقت معاملہ برعکس ہوگا۔ طاقت کمزوری سے بدلی ہوئی ہوگی اور کمزوری طاقت کا لباس پہنے ہوئے ہوگی۔پھر ایک وقت میں جس نے شکست کھائی اس کے دل میں جذبہ انتقام ہے وہ وقت کا منتظر ہے کہ جب موقع ملے تو اس کا بدلا لوں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تصادم کا ایک لا متناہی

سلسلہ قائم ہو۔یہ دنیا کیا ہوئی خونخوار درندوں کا مجمع جس میں ہر ایک دوسرے کو دیکھ کر منھ کھولتا ہے اور دانت باہر نکالتا ہے اور موقع پاتے ہی جھپٹ پڑتا ہے۔کیا دنیا کی آبادی کی یہی صورت ہے؟ کیا اس طرح عالم کا نظام درست ہو جائے گا ؟ پھر کیا ہو؟ یہ نظام اگر درست ہوسکتا ہے تو اس کے ماننے سے جس کا نام ہے خدا کیونکہ اب ایک طاقتور انسان اپنے دست و بازو کو دیکھتا ہے۔ اپنے اقتدار کو دیکھتا ہے اور اپنی طاقت کو دیکھتا ہے۔

ان سب کی بناء پر یہ سمجھتا ہے کہ میں اس کمزور شخص کو فنا کر دوں گا۔لیکن اسے اس کے ساتھ یہ بھی احساس ہے کہ اگر میں اس کو اس وقت ختم کردوں تو مجھ سے ایک بالادست طاقت موجود ہے جو اس کو فنا کرسکتی ہے۔دیکھئے دنیا میں دو چیزیں ہیں جو قوت عمل کو فنا کرتی ہیں۔ ایک انتہائی اطمینان۔ دوسرے انتہائی مایوسی۔ دنیا میں صرف مادی غلبہ و اقتدار کے لحاظ سے دیکھئے تو ایک طاقتور انسان پورا اطمینان رکھتا ہے اپنی کامیابی کا اس لیے اسے احساس فرائض کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی اور ایک کمزور انتہائی مایوسی اور نامبداءی رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اپنے ماحول کو دیکھتا ہے تو کوئی سہارا نظر نہیں آتا۔اس انتہائی مایوسی کا نتیجہ کہ وہ اس طاقتور کے مقابلہ میں بالکل سپر انداز ختم ہو جائے۔ اور اپنی ہستی کو خود سپرد فنا کردے۔

لیکن خدا کے وجود کا اعتقاد یہ وہ ہے کہ جو اس کے کامل اطمینان میں ایک تموج اندیشہ کا پیدا کرتا ہے اور اس کی کامل مایوسی میں ایک لہر امید کی پیدا کرتا ہے۔اس کا یہ اعتقاد جسے چاہے خوف خدا کہہ لیجیے اور چاہے اندیشہ سزا سے تعبیر کیجئے۔ اس کے غرور تفوق میں ایک پہلو اعتدال کا پیدا کریگا جس کی بناء پر اسے یہ خیال پیدا ہوگا کہ اگر میں ایسا کروں تو خدا کو برا نہیں معلوم ہوگا۔ یہ سوچ کر

اس کا ہاتھ رکے گا۔اور اس کا یہ اعتقاد جسے خدا پر توکل سے تعبیر کیجئے اس کے دل کو اس کے مقابلہ میں قوی رکھے گا اور اس لئے یہ جلدی سے بے دست و پا اور سپر انداز ختم نہیں ہو جائے گا۔

کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں اس وقت کمزور سہی لیکن اس سے بالاتر ایک قوت موجود ہے۔"دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تراست"۔

اس کی قوت و قدرت بہت بڑی ہے اور وہ مجھے فتح دینے پر قادر ہے۔ یہ خیال اسے سہارا دیتا ہے اور وہ قوت عمل کے صرف کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔وہ دل کی قوت اس کے بازوؤں کو زور و طاقت سے بھر دیتی ہے اور وہ اپنے انہی کمزور بازوؤں پر کچھ کرلیتا ہے جو ایک کمزور دل والا انسان اپنے قوی بازوؤں سے نہیں کرسکتا۔اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کا ماننا وہ چیز ہے جو دنیا کی غیر متوازن طاقتوں میں توازن پیدا کرتا ہے۔ عالم کی غیر مساوی قوتوں کو ایک طرح کی مساوات کی سطح پر لاتا ہے۔ احساس عمل کو بیدار کرتا ہے اور قوت مدافعت کو تقویت پہنچاتا ہے۔

اس کے ساتھ زبردست کے دل میں رحم و کرم کا جذبہ پیدا کرتا ہے ۔ اور انصاف کے سامنے اس کی گردن کو خم کردیتا ہے۔میں نے ابھی آپ کے سامنے اس صورت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ہاتھ میں تلوار۔ بازوؤں میں طاقت۔ سامنے مظلوم کا گلا۔ اور اس کے قتل کے صلہ میں بے شمار دولت کے حصول کی امید۔ سب محرکات قتل موجود ہیں۔تلوار کی باڑھ کہتی ہے کہ گلا کاٹ دو۔ بازوؤں کی سکت کہتی ہے کہ قتل کر ڈالو۔ مظلوم کا گلا دعوت دے رہا ہے کہ میری باریک رگیں قطع کر دو۔نتیجہ کا خوشگوار تخیل پکار رہا ہے کہ اسے قتل کر کے اس دولت کو حاصل کرلو۔ مگر دل کے اندر سے کوئی

صدا دیتا ہے۔ خبردار ! اگر تلوار چلی تو یہ سمجھ لو کے خدا کا بھی سامنا کرنا ہے۔وہاں کے لئے بھی کوئی جواب ہے ؟ یہ جذبہ اسی خدا شناسی کا نتیجہ ہے جو دل کی گہرائیوں سے انسان کے افعال کا احتساب کرتی ہے۔افراد انسانی میں باہم ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ خدا کے وجود کا اقرار نہ ہو۔ کیونکہ وہ جسے کہتے ہیں حق الناس۔

اس کا عائد کرنے والا کون ہو گا۔ یعنی مجھ پر آپ کا حق اور آپ پر میرا حق عائد کون کرے گا۔ جب تک کوئی ایک مشترک قوت ہم سب پر کار فرمائی نہ جائے۔مادی نقطہ نظر سے انکار خدا کے نظریہ کے لحاظ سے میں سچ کہتا ہوں کے اگر کوئی شخص امانت و دیانت۔ عدالت و انصاف وغیرہ وغیرہ کے نام لیتا ہے تو یاد رکھیے کہ یہ سنی سنائی باتیں ہیں ۔اہل مذہب کی زبان پر آئے ہوئے الفاظ ہیں جو ان لوگوں کو بھی پہلے سے یاد ہو گئے ہیں ورنہ حق شناسی کا مادی نقطہ نظر سے کوئی مفہوم ہی نہیں ہے۔

عدالت کے کیا معنی ہیں۔

تقسیم حقوق کس لئے ہو جبکہ جو کچھ ہے وہ دنیا کی طاقت اور دنیا کی طاقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔ وہ کمزور انسان جس میں قوت مدافعت نہیں ہے اسے ہمارے مقابلہ میں فنا ہو ہی جانا چاہیے اور وہ اسی کا مستحق ہے۔ ہمیں کیا ضرورت کہ ہم اس کو کوئی رعایت کریں۔اس لئے کہ ہم ہیں اور ہماری یہ زندگی ہے اور ہم کو اسی میں کامیابی حاصل کرنا ہے آج ہم اس کمزور کے مقابلہ میں اپنا ہاتھ روکیں تو کس کے سہارے پر اور کس امید پر۔آخر کس دن کے لئے جبکہ اس کے بعد کوئی دن بھی نہیں۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں۔جو کچھ مل سکے ہم لے لیں۔چاہے دوسرا مرے یا زندہ رہے۔یہ سب باتیں کہ

دوسرے کے حقوق کا خیال ہو۔ اس کے ساتھ مساوات صرف کی جائے۔ ظلم و تعدی سے ہاتھ کو روکا جائے۔ یہ سب ایک خدا کے ماننے کے نتائج ہیں۔ ممکن ہے ظاہری طور پر خدا کے اقرار کرنے والی جماعت بھی عملی طور پر اس کی پابند نہ ہو لیکن یہ اس کا نتیجہ ہوگا کہ حقیقی حیثیت سے اس کے دل میں وہ اعتقاد جاگزیں نہیں ہی لیکن کم از کم لفظی حیثیت سے یہ تمام باتیں اہل مذہب کی شائع کی ہوئی ہیں اور ان ہی کا دیا ہوا سبق ہے جو عالم انسانی میں عموماً پڑھا جارہا ہے۔

جس کا نتیجہ ہے کہ مادی دنیا والوں کی زبان پر بھی وہ الفاظ آ ہی جاتے ہیں۔ اگرچہ ان لوگوں کی زبان سے وہ شرمندہ معنی بالکل نہ ہوں۔میں کہتا ہوں کہ دنیا کی آبادی ۔ دنیا کی نجات ۔ دنیا کا انتظام۔ دنیا کا تمدن۔ان سب کا سنگ بنیاد ہے ۔ خدا کا احساس جس کا نام ہے ۔خدا کی معرفت ۔یہ احساس جتنا زیادہ پیدا ہوگا اتنا ہی افعال میں توازن پیدا ہوگا ۔اس لیے کہ انسان کے اعضاءوجوارح مختلف قوتوں کے زیر اثر کام کرتے ہیں اور یہ تمام مختلف قوتیں جا کر سمو جاتی ہیں انسان کے نفس ناطقہ میں ۔ جسم انسانی میں ہاتھ پاؤں آنکھیں وغیر سب الگ الگ ہیں اور ان میں ودیعت شدہ طاقتیں جدا جدا ہیں اور ان کے کام علیحدہ علیحدہ ہیں۔مگر یہ مختلف قوتیں سب جا کر ایک ہو جاتی ہیں اسی سے نفس ناطقہ میں وعلیک ہونا جسے میں نے سمونے کے لفظ سے تعبیر کیا ہے ۔ اسی لیے حکماء نے کہا ہے۔

"النَفْسُ فِي وَحْدَتِيَ كُلُ الْقُوِي"۔

ترجمہ:"نفس انسانی اپنی یکتائی کے ساتھ تمام قوتوں کا مجموعہ ہے" ۔ اسی وحدت کی شیرازہ بندی ہے کہ اس کثرت کا انتظام درست رہتا ہے ۔جوارح و اعضاء کے افعال میں تصادم نہیں ہوتا ۔ بلکہ وہ

سب ایک نظام کے اوپر کارفرما ہیں ۔اس لیے کہ اصل میں ان سب کی کارگزار ایک واحد طاقت ہے ۔ معرفت خدا کا احساس براہ راست اس چیز کو متاثر بناتا ہے جو ان افعال کا سرچشمہ ہے یہی فرق ہے اعتقادواعمال میں ۔ عمل انسانی اعضاءوجوارح کے اعتبار سے جزئی حیثیت رکھتا ہے اور اعتقاد کلی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس لیے اعضاءوجوارح کے افعال میں تلازم نہیں ہے کہ اگر ہاتھ نیک کام کرتے ہیں ۔ تو پاؤں بھی نیک کام کریں ۔ زبان بھی نیک کام کرے ۔ ممکن ہے کہ پاؤں صحیح راستے پر جا رہا ہو اور اس وقت نگاہ غلط راستے پر ہو ۔اسی طرح تمام اعضاءوجوارح ۔بوقت واحدان کے افعال میں حسن و قبح کی حیثیت سے اختلاف ہو سکتا ہے ۔

مگر یہ اختلاف ان میں کب تک ہے ؟ جب تک یہ تمام افعال کسی خاص نفسانی احساس اور جزبہ کے ماتحت نہیں ہیں ۔ لیکن اگر کسی چیز نے نفس کو متاثر کردیا ہے تو آپ کے افعال میں یکرنگی پیدا ہونا ضروری ہے ۔ اب اس جزبہ کا اثر پیروں پر بھی پڑے گا ۔آنکھوں پر بھی پڑے گا ۔ہاتھوں پر بھی پڑے گا ۔جتنی قوتیں اور جتنے اعضاءوجوارح انسان کے ہیں سب اس سے متاثر ہونگے ۔

عمل کی قوت کو اگر آپ دیکھیے تو ملاحظہ کیجئے ۔ عمل کی قوت کاہے سے بڑھتی ہے ؟ مشق سے براہ راست عمل کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے ۔اگر آپ اچھے اچھے کاموں کی عادت ڈالنا شروع کر دیں تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ آپ قوت عمل کو بڑھا رہے ہیں ۔ مگر یہ قوت عمل کا بڑھانا محدود اثر رکھتا ہے ۔ یعنی جس شعبہ میں جس چیز کی قوت آپ بڑھا رہے ہیں اسی میں اضافہ ہوگا ۔مثلاً آپ نے کسی بچہ کی زبان کو سچ بولنے کی عادت ڈال دی وہ اب بیشک سچ ہی بولے گا ۔مگر یہ کہ وہ کوئی

شرارت جو ہاتھ سے متعلق ہے اسے بھی نہ کرے ۔یہ ضروری نہیں ہے ۔اگر کسی کے پیروں کو مسجد میں جانے کی عادت پڑ جائے گی وہ ضرور جائے گا کیونکہ عادت خود محرک عمل رکھتی ہے لیکن اس کا اثر محسوس کرے گا اسی شعبہ سے جس کی عادت پڑ گئی ہے ۔ بےشک کہ اگر کسی واعظ کا بیان ہو اور مجلس و وعظ منعقد ہو تو وہ عادت ہرگز اس موعظہ میں شرکت کی محرک نہ ہوگی ۔ یہ کیا بات ہے ؟ وہی کہ جو اصلاح کر رہے ہیں وہ براہ راست عمل سے متعلق ہے اس لیے جس شعبہ میں عمل کا موقع ملا ہے وہیں اس کا اثر ظاہر ہو گا ۔

لیکن اگر آپ اس کی اصلاح کا تعلق اس کے نفس کے ساتھ ہے یعنی آپ نے اس کے دل میں کوئی جزبہ پیدا کر دیا ہے جو اس قسم کی تمام باتوں کا محرک ہوا کرتا ہے تو اب آپ کو ایک ایک کر کے ان تمام باتوں کی عادت ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ بس وہی ایک جزبہ جسے آپ نے کسی ذریعہ سے اس کے دماغ میں راسخ کر دیا ہے وہی ان تمام افعال کا محرک ہو گا جو اس کے جزبہ کے ماتحت ہیں ۔ خواہ وہ افعال ہاتھ سے متعلق ہوں یا پاؤں سے یا کسی اور چیز سے ۔

عمل کا اثر محدود ہوتا ہے ۔ مگر اعتقاد تصور اور تخیل جو نفس کو براہ راست متاثر کرتے ہیں ان کا اثر غیر محدود ہوتا ہے ۔ یہ اعتقاد کے ضروری ہونے کا خاص فلسفہ ہے ۔ اعتقاد جا کر نفس انسانی کو پابند بناتا ہے اور جب نفس پابند ہوگیا تو اب ایک ایک بات میں زحمت و مشقت کی ضرورت نہیں ہے ۔ بلکہ اعتقاد نفسی خود افعال کا محرک ہو گا ۔اس وقت سوچنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ پیروں کا کام ہی ہاتھوں کا کام ہے یا آنکھوں کا کام ہے بلکہ اب کام تو نفس کا ہے اور نفس اپنے ذاتی احساس سے ان تمام افعال کا محرک ہو گا ۔

یہ احساس جتنا قوی ہو گا اتنا ہی افعال میں اس کا اثر نمایاں ہو گا ایک درجہ ہے اس کا عدالت جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان جان بوجھ کر گناہوں کا ارتکاب نہ کرے ۔ اور اسی کا قوی درجہ ہے عصمت جس معنی یہ ہیں کہ اعتقاد اور احساس فرائض نفس میں اتنا راسخ ہوگیا ہے کہ کسی وقت نظر انداز ہو ہی نہیں سکتا ۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بھولے چوکے بھی گناہ نہ ہو جس طرح اگر آپ کوئی کتاب یاد کیجیے ۔ اگر آپ میں حفظ کی طاقت کم ہے تو غلطیاں بہت ہو نگی ۔ اور جتنا اس وقت میں اضافہ ہو گا اتنا غلطیوں کا وقوع کم ہو گا ۔

ممکن ہے ایک درجہ ایسا آئے کہ اب کھلی ہوئی فاس غلطی کوئی نہ ہوتی ہو لیکن چھوٹی چھوٹی مخفی غلطیاں ہو جاتی ہوں ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابھی پورے طور پر توجہ قائم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور توجہ ہٹنے کی صورت میں غلطی ہو جاتی ہے ۔ لیکن اگر یہ حفظ بلکل ملکہ کی صورت سے ذہن میں راسخ ہوگیا تو پھر کسی طرح کی غلطی نہ ہو سکے گی ۔ یہاں تک کہ اب بھول چوک کی غلطی کا بھی سدباب ہو جائے گا ۔

بس اسی طرح گناہوں سے حفاظت کو سمجھ لیجئے ۔ احساس فرائض کا ایک درجہ وہ یہ ہے کہ انسان بڑے بڑے جرائم کا بالکل ارتکاب نہیں کرتا مگر معمولی قسم کے گناہ اس سے ہو جاتے ہیں پھر بھی ان پر اصرار سے کام نہیں لیتا لیکن اس سے زیادہ مکمل درجہ وہ یہ کہ اب انسان کسی طرح کا گناہ نہیں کرتا اور اس سلسلہ میں کبھی بھول بھی اس کو نہیں ہوتی اسی کا نام ہے عصمت یہ بجائے خود ہر زمانہ میں ممکن الوقوع ہے یہ اور بات ہے کہ ثبوت اس کا سوائے مخصوص افراد کے دوسروں کے لیے نہیں۔یہ درجے کا ہے کے ہیں ؟ یہ حقیقتاً معرفت خدا کے درجے ہیں جتنی یہ معرفت قوی ہوگی

اتنا ہی احساس فرائض زیادہ ہوگا اور اسی قدر افعال میں انضباط و انتظام پیدا ہو گا ۔ اس لیے حسن عمل اگر ضروری چیز ہے تو اس کے لیے معرفت خدا اور اعتقاد پہلے ضروری ہے ۔ اور دنیوی و اخروی فلاح و نجات کا اس پر انحصار یقینی ہے ۔

☆☆☆☆☆

خداکاوجود

اب تک میں نے خدا کو ایک مفروضہ شئے قرار دیتے ہوئے اس کی معرفت کی دشواریوں اور ان کے حل۔ اس کے بعد اس کی ضرورت اور نظام عالم میں اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا۔اب منزل ہے اس کی کہ خدا کے وجود کے متعلق روشنی ڈالی جائے کہ اس کی ہستی کو مانا کیوں جائے؟ چونکہ دنیا میں جہاں ہر مسئلہ میں اختلاف ہوا وہاں خدا کے وجود کے مسئلہ بھی محل اتفاق نہیں رہا۔ اس میں آراء و خیالات کے تصادم نے ایک عظیم تفرقہ کی صورت پیدا کر دی ہے۔

ایک جماعت دنیا میں ایسی موجود ہے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کی منکر ہے اور کہتی ہے کہ اس عالم کے لئے کسی خاص خالق کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں اہل مذاہب ہیں ۔ قطع نظر کیجئے اس تفرقہ سے جو خود ان میں خدا کے اوصاف کے متعلق پایا جاتا ہے لیکن یہ سب اس کے وجود کے قائل ہیں۔میں نے اس سلسلہ بیانات کے شروع میں خدا کے انکار و اقرار کی تفریق کو اس طرح بیان کیا تھا کہ عالم کے لیے ایک مبداء اول کے تو سب قائل ہیں لیکن بحث اس میں ہے کہ وہ کوئی ذی شعور اور صاحب ارادہ ہستی ہے یا نہیں۔

مادیین بھی اس عالم کے لئے ایک مبداء مانتے ہیں۔ وہ ذرات مادہ سہی مگر وہ اس کو ذی شعور و ارادہ نہیں مانتے۔اس کے مقابلہ میں وہ لوگ جو خدا کے وجود کے قائل ہیں اس کو صاحب شعور و ارادہ قرار دیتے ہیں ۔اب ان دونوں جماعتوں کے نقطہ نظر میں ایک دوسری صورت سے فرق سنئے۔ وہ لوگ جو مادتیین و طبیعیین ہیں اور خدا کے وجود کے منکر ہیں۔وہ اس عالم کے لئے کسی موجد کے قائل نہیں ہیں بلکہ اس کے مادی اجزاء ہی کو اس کے وجود کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔

کیونکہ عام طور سے جو چیز عدم کے بعد وجود میں آتی ہے اور مرکب ہے اس میں چار چیزیں باعث وجود ہوتی ہیں ۔ایک وہ اجزاء جن سے مل کر یہ چیز بنتی ہے دوسرے وہ ہئیت جو ان اجزاء کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے۔ تیسرے وہ مقصد جو اس کے عالم وجود میں آنے پر مترتب ہوتا ہے۔ چوتھے وہ بنانے والا جو ان اجزاء کو ترکیب دیکر اس صورت میں لاتا ہے۔مثلاً ایک دوا ساز جس نے ایک معجون تیار کیا۔ جس کا اثر ہے دل و دماغ کو تقویت پہنچانا۔ اس میں وہ مفرد ادویہ جن سے یہ معجون بنا ہے پہلی چیز ہے اور وہ صورت جو ان اجزاء کے ملنے سے حاصل ہوتی ہے ۔

دوسری چیز ہے اور تقویت دل و دماغ تیسری چیز اور وہ دوا ساز جو اس معجون کو بناتا ہے چوتھی چیز ہے ۔ یہ صورت ہر مرکب میں پائی جاتی ہے۔ ان میں سے پہلی چیز وہ ہے جسے اصطلاح میں علت مادیہ کہا جاتا ہے ۔اور آخری چیز وہ ہے جسے علت فاعلیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مادیین اس عالم کائنات کے لئے صرف علت مادیہ کے قائل ہیں اور اسے کافی سمجھتے ہیں ۔ ان اجزاء کو موجد کہنا درست نہیں ہے کیونکہ موجد تو اس شئے سے علیحدہ ایک جداگانہ ہستی رکھتا ہے۔جو ان اجزاء کو ترکیب دے کر اس شئے کو عالم وجود میں لائے اسی کو علت فاعلیہ کہتے ہیں۔ جیسے معجون کے لئے دوا

ساز مکان کے لئے معمار تخت کے لئے نجار وغیرہ اس کو مادیین تسلیم نہیں کرتے۔ وہ موجد یا علت فاعلیہ کے منکر ہیں۔خدا کو ماننے کے یہ معنی ہیں کہ اس تمام دنیا کے لئے ایک موجد ہے جو اس دنیا سے علیحدہ ہے اسی کو خالق کہتے ہیں ۔اب درحقیقت بحث جو کچھ ہے ہمارے اور ان کے درمیان وہ یہ ہے کہ عالم کائنات کے لئے کسی ذی شعور موجد کی ضرورت ہے یا نہیں۔ یعنی آیا اشیائے عالم خود بخود عالم وجود میں آگئے ہیں یا ان کا کوئی وجود میں لانے والا ہے۔

☆☆☆☆☆

ارادی اور غیر ارادی اشیاء کا تفرقہ

دنیا میں کوئی مسئلہ اس وقت تک طے نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کے لئے کوئی باضابطہ معیار نہ مقرر کیا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عالم میں بہت سی چیزیں بغیر ارادہ و اختیار کے ہوتی ہیں۔ مرتعش کا ہاتھ تھرتھراتا ہے بغیر ارادہ و اختیار کے اور کاتب کے قلم کو حرکت ہوتی ہے ارادہ کے ساتھ۔

ہذیان بکنے والے کی زبان کی گردش اس سے بھی الفاظ پیدا ہوتے ہیں۔ زبان رکتی ٹھرتی گھٹتی بڑھتی ہے اور حروف کی تشکیل کرتی ہے۔ اور ایک خطیب بھی جب تقریر کرتا ہے تو اس کی زبان بھی الفاظ اور حروف کو پیدا کرتی ہے مگر اس کو کہتے ہیں اختیاری اور اس کو کہتے ہیں اضطراری۔ایک آدمی کا کوٹھے پر سے پاؤں پھسلتا ہے زمین پر گر پڑتا ہے اور ایک آدمی کوٹھے پر سے پھاند پڑتا ہے۔ ذریعہ ایک ہے نتیجہ ایک ہے۔ وہ بھی اوپر سے نیچے آیا۔ یہی فضا اس نے بھی طے کی۔ مگر اس کو اضطراری کہتے ہیں اس کو اختیاری۔

ایک دیوانہ ہے حالت جنون میں کچھ نہ کچھ کہتا ہے۔ کوئی اس کی طرف اعتناء نہیں کرتا۔ اور ایک دانشمند انسان کلام کرتا ہے ہر شخص سننے لگتا ہے۔ توجہ کرتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ پہلا کلام ارادہ و شعور کا نتیجہ نہیں ہے۔ اور دوسرا شعور و ارادہ کے ماتحت ہے۔آپ دنیا کی سیر کیجیئے۔ اطراف زمین میں سیاحت فرمایئے۔ آپ کے سامنے مختلف طرح کے نقشے پیش ہونگے۔ جن میں آسانی سے آپ یہ تمیز کرلیں گے کہ کون ان میں سے خودبخود موجود ہوگئے ہیں اور کون کسی باہوش ہستی کی کارگزاری کا نتیجہ؟

آپ کو معلوم ہے کہ ریگستان میں ہوا جو چلتی ہے وہ اپنے ساتھ ذرات کو ریگ لاتی ہے۔ ان ہی سے بڑے بڑے ٹیلے ریت کے ہوجاتے ہیں اور اس کی وجہ سے کہیں نشیب ہوجاتا ہے کہیں فراز ۔ کہیں پستی اور کہیں بلندی۔ آپ ان مناظر کو دیکھ کر کبھی یہ تجویز نہیں کرتے کہ کوئی اس میدان میں آیا تھا اور اس نے خاص طور سے کہیں پر اونچا کیا ہے اور کہیں پر نیچا بلکہ اس کو دیکھ کر ہی سمجھ لیتے ہیں کہ ہوا کی وجہ سے اونچا نیچا ہوگیا۔

مگر جنگل ہی میں جب کارواں سرا ملتی ہے جس میں آپ قیام کرتے اور آرام لیتے ہیں تو دل دعا دینے لگتا ہے کہ خدا بھلا کرے اس کا جس نے یہاں اس مکان کی تعمیر کردی۔ اسے دیکھ کر آپ نے یہ طے نہیں کیا کہ شاید ہوا کی حرکت سے اور ذرات کے اجتماع سے یہ مکان تیار ہوگیا ہو۔دنیا جانتی ہے کہ زمین میں قوت استحجار ہے یعنی پتھر کی شکل میں ذرے مٹی کے تبدیل ہوجاتے ہیں اور آفتاب کی شعاعیں زمین کی خاصیت کے لحاظ سے ان اجزاء کو مختلف صورتوں میں رنگ دیتی ہے۔ ان ہی سے مختلف پتھر پیدا ہوتے ہیں ۔ عقیق۔ زمرد ۔ یاقوت ۔ اور دھاتیں پیدا ہوتی ہیں ۔ سونا چاندی لوہا تمام

معدنیات کی یہی نوعیت ہے۔یہ ظاہر ہے کہ پتھر جو زمین میں پیدا ہونگے کچھ نہ کچھ ان کی ہندسی شکلیں بھی ہوں گی۔ کیونکہ شکل و مقدار ہر جسم کے لئے ضروری ہے۔ کوئی مثلث ہو گا اور کوئی مربع ۔ اور کوئی مدور ہو گا اور کوئی مکعب۔ مگر ان کو دیکھ کر آپ یہ فیصلہ نہیں کرتے کہ کسی نے ان پتھروں کو اس طرح سے تراش کر ان پہاڑوں میں دفن کر دیا ہے۔

آپ اس کو زمین کی قوت طبعی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اسی زمین میں جب مختلف ظروف اور اس طرح کی چیزیں دکھلائی دیں جو خاص ضروریات سے متعلق ہیں جیسے کفگیر، چمچے، دیگ، پتیلیاں وغیرہ تو انھیں عقلائے عالم نے زمین کی پیداوار قرار نہیں دیا بلکہ یہ رائے قائم کی کے ایک زمانہ ایسا تھا کہ جب انسان اپنے ضروریات پتھروں سے پورے کرتا تھا ۔ اس کی وجہ سے ایک تاریخی دور کا انکشاف ہوگیا جس کا نام رکھا گیا عصر حجری یعنی پتھر والا زمانہ۔

یہ کس لئے ؟ آخر یہ کیوں نہ سمجھا گیا کہ جس طرح زمین میں بہت سے پتھر مختلف شکلوں کے پیدا ہوتے ہیں ۔ اسی طرح یہ چیزیں زمین میں طبعی قوت سے پیدا ہوگئی ہیں اور کسی شخص خاص کی کارگزاری کا نتیجہ نہیں ہیں۔عہد قدیم میں تاریخ تو لکھی جاتی نہ تھی۔ اس زمانہ کی تاریخیں اب انہی حفریات اور آثار قدیمہ کے ذریعہ سے مرتب کی جارہی ہیں اس کے لئے مہمیں مقرر کی جاتی ہیں اور بڑے بڑے علمائے طبیعیات، علمائے السنہ، اور انجینئر جاتے ہیں۔ کھنڈروں کو بڑے بڑے ٹیلوں کو اور زمین کے مختلف حصوں کو کھود کر ایسی چیزیں برآمد کی جاتی ہیں جن سے سابقہ حالات کا پتہ چلے۔ وہاں کوئی بتانے والا بیٹھا نہیں ہے مگر یہی خاموش آثار ہیں جن کے ذریعہ سے ہم پتہ لگاتے ہیں کہ اس زمانہ کے حالات یہ تھے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ کہیں پر تو آپ جلدی سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ ارادہ و اختیار کا نتیجہ ہے اور کہیں کہتے ہیں کہ بغیر ارادہ و اختیار خود بخود ہے یہ آخر معیار کون سا ہے؟ یہ کیا بات ہے کہ دیوانہ آپ کے سامنے باتیں کرتا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ اس کا دماغ خراب ہے اور ایک فاضل مقرر تقریر کرتا ہے ۔ آپ یہ شبہہ نہیں کرتے کہ اس کا دماغ بھی خراب ہے اور اس دیوانگی کی رو میں یہ تقریر کررہا ہے۔ اگر آپ کہیں کہ مجنون کی تقریر کو مجنونانہ سمجھنا پہلے سے اس کے جنوں کا علم ہونے کی وجہ سے ہے اور مقرر کی تقریر کو نتیجہ عقل و فہم سمجھنا اس حسن ظن کی بناء پر ہے جو ہر انسان کے ساتھ ہونا چاہیے۔

جب تک کافی ثبوت نہ ہو کسی کے متعلق انسان کو یہ رائے قائم کرنے کا حق نہیں کہ اس کا دماغ خراب ہے۔ میں عرض کروں گا کہ بندہ پرور !اول تو یہ حسن ظن ہے اور حسن ظن سے کبھی یقینی نتیجہ بر آمد نہیں ہوسکتا حالانکہ ہم اپنے وجدان کے لحاظ سے ان صورتوں میں جب ہمارے سامنے کوئی فاضلانہ تقریر عالمانہ تصنیف ہو یقین کا احساس رکھتے ہیں اس امر کے متعلق کہ یہ ایک وسیع علم اور ادراک کا نتیجہ ہے ۔

آپ ہی اپنے دل کی گہرائیوں میں اندازہ لگایئے کہ کس اعلیٰ درجہ کہ کاتب کی تحریر اور نقاش کہ نقش یا بڑے قابل و لائق شخص کی تصنیف کو دیکھ کر جو اس کی تعریف کرتے ہیں تو کیا وہ صرف حسن ظن کی بنیاد پر ہے یعنی دل میں یہ شبہہ موجود ہے کہ شاید اس کا دماغ خراب ہو اور جنون کے عالم میں یہ تحریر ، نقش اور تصنیف عالم وجود میں آگئی ہو؟ ہرگز نہیں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ کو یقین ہے کہ اس کا لکھنے والا بلکل صحیح الدماغ ہے اور اس نے قدرت و اختیار کے ساتھ اس کو لکھا

ہے۔ اس امر کا اس درجہ یقین ہوگا کہ آپ اس خیال کو کہ وہ غیر ارادی طور پر وجود میں آیا ہے خود دیوانگی کا نتیجہ قرار دینگے اور کہیں گے کہ یہ ہرگز عقل میں آنے کی بات نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف حسن ظن کا نتیجہ نہیں ہے۔

دوسرے یہ آپ کا بتایا ہوا معیار شکست ہوجاتا ہے اس طرح کہ وہی شخص جس کی تحریر و تقریر کی آپ تعریف کر رہے تھے خدا نخواستہ دیوانہ ہو جائے اس کا دماغ خراب ہو جائے بہکی بہکی باتیں کرنے لگے تو آپ فوراً حکم لگا دینگے کہ اس کا دماغ خراب ہوگیا اب آپ حسن ظن سے کام نہیں لیتے اور وہی مجنون جس کے متعلق سابق سے معلوم ہے کہ اس کا دماغ خراب ہے اگر اچھا ہو جائے۔ٹھیک طور پر باتیں کرنے لگے تو آپ خود سمجھ لیں گے کہ وہ صحیح ہوگیا اس کا عارضہ دور ہوگیا۔ یہ آپ کیونکر اندازہ کرتے ہیں ۔

معلوم ہوتا ہے اس کا سبب کچھ اور ہے اور کوئی ایسا معیار موجود ہے جس کی بناء پر خود افعال بتلاتے ہیں کہ ان کا کرنے والا صاحب شعور و اختیار ہے یا نہیں ۔پھر اس آخری مثال میں جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی وہ زمین سے نکلے ہوئے ظروف اور مختلف طرح کے آلات و اسباب ان میں تو کوئی شخص سامنے ہے ہی نہیں جس کی نسبت حسن ظن سے کام لیا جائے۔

یہاں صرف ایک بے زبان صنعت ہے جو بتلاتی ہے کہ اس کا کوئی صناع ہے اور وہ صاحب ارادہ و اختیار ہے۔معلوم ہوا کہ یہ معیار جو بنایا گیا ہے درست نہیں ہے۔ پھر کیا معیار ہے؟ اچھا مجھ سے سنئے اور اگر اس کے علاوہ کوئی بات ٹھیک نہ اترے تو تسلیم کیجئے کہ یہی معیار درست ہے۔وہ یہ ہے

کہ جب کوئی بات اغراض و مقاصد کے موافق منظم و مرتب صورت سے ہوگی اور ایک خاص نظام اور توازن رکھتی ہوگی تو وہ شعور و اختیار کا نتیجہ قرار پائیگی۔ اور جب مقصد و غرض کے لحاظ سے اس میں کوئی نظم و ترتیب نہ ثابت ہوتو وہ شعور و اختیار کی طرف منسوب نہ ہوگی۔اسی معیار سے آپ ایک مجنون کو جنون و صحت کی حالت کا موازنہ کرتے ہیں ۔

جب تک اس کے الفاظ نامربوط اس کا کلام بے تسلسل ہے آپ سمجھتے ہیں کہ وہ جنون کا نتیجہ ہے۔ اور جس وقت سے اس کے افعال و اعمال میں انتظار و ارتباط پیدا ہو اور وہ اغراض و مقاصد کے ماتحت ہوگئے اسی وقت سے آپ اسے صاحب عقل سمجھنے لگے۔ جتنی ہی یہ بات زیادہ ہونی ہے اتنی عقل و شعور پر زیادہ روشنی ڈالتی ہے۔ یہی وہ معیار ہے جو صرف شعور و عدم شعور ہی کو نہیں بلکہ شعور و اختیار کے مختلف مراتب کا بھی پتہ دیتا ہے اور اس کی مقدار کا تعین کرتا ہے۔

اگر کوئی دیوانہ علاج کے بعد اس درجہ پر آگیا کہ پانچ باتیں ٹھیک کہتا ہے اور چار باتیں بہک کر غلط کہہ دیتا ہے تو آپ سمجھتے ہیں کہ ابھی اس کا مرض پورے طور پر زائل نہیں ہوا۔ یہ صحت کے قریب آگیا ہے اور اگر سب باتیں بالکل ٹھیک کرنے لگا تو آپ سمجھتے ہیں کہ اب بالکل اس کی عقل صحیح ہوگئ ۔اس معیار کی بناء پر آپ ریگ کے تو دوں کو ارادہ و اختیار کا نتیجہ نہیں قرار دیتے کیونکہ وہ کسی خاص مقصد و غرض کے ماتحت نظر نہیں آتے لیکن جنگل میں تعمیر شدہ مکان یا سرائے کو آپ کسی شخص کی کارگزاری کا نتیجہ سمجھتے ہیں ۔اسی بناء پر زمین کے پیدا ہونے والے معدنیات کو باوجود شکل و مقدار رکھنے کے آپ کسی خاص شخص کی طرف منسوب نہیں کرتے کیونکہ وہ شکلیں کسی خاص تناسب سے نہیں پائی جاتیں لیکن زمین سے نکلے ہوئے برتنوں کو انسانی کارگزاری سے وابستہ سمجھتے

ہیں۔ اس لئے کہ وہ انسانی ضروریات و اغراض سے متعلق ہیں ۔معلوم ہوا کہ ضروریات کہ لحاظ سے تناسب۔ نظم ۔ اور ارتباط یہی وہ چیز ہے جو موجد کا پتہ دیتی ہے اور اس کے شعور و اختیار کی دلیل ہوتی ہے۔حالانکہ آپ نے ان مثالوں میں موجد کو دیکھا نہیں تھا۔ بس یہی تھا کہ نقش کو دیکھ کر نقاش کا پتہ لگا لیا۔ صانع کو دیکھ کر مصنوع کی طرف ذہن کا انتقال ہوا۔

☆☆☆☆☆

موجد کی تلاش

دنیا کے مختلف صنائع جو آپ کے سامنے آتے ہیں ان میں قبل اس کے کہ آپ کو موجد کا پتہ چلے کہ کون ہے اجمالاً یہ ذہن میں آجاتا ہے کہ کوئی موجد ہے۔ یہی پیش خیمہ ہوتا ہے اس سوال کا کہ اس کا موجد کون ہے ؟یہ انسان کی بالکل فطری اور تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ کون ہے ؟ میں دھوکا ہوتا ہے اور اختلاف پیدا ہوسکتا ہے مگر کوئی ہے میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔

یہ صنعتیں جو آپ کی نظر کے سامنے آتی ہیں۔ ان میں واقعی حیرتناک چیزیں پائی جاتی ہیں کیونکہ ہم ان کے اسرار سے واقف نہیں ہیں ۔ ریل ۔ موٹر ۔ جہاز ۔ اور ہوائی جہاز ہر ایک ہی ایجاد ہے اور ہم ان کے موجدین کی تعریف کرتے ہیں۔ فرض کیجئے آپ جرمنی یا امریکہ کے کسی کارخانہ میں تشریف لے جایئے۔ لوہے کی مشینیں آپ کی نظر سے گزریں جو کوئلہ اور پانی کی مدد سے چلتی ہیں ۔

آپ ان مشینوں کو دیکھ کر حقیقتاً ششدر رہ جائیگا۔ مشین کے پرزے تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں ۔ ایک عالم ہے جو حرکت میں ہے ۔ آپ کہئے گا کہ بنانے والے نے خوب مشین بنائی ہے۔اب آپ کا

ساتھی آپ سے کہے اور قسمیں کھا کھا کر بیان کرے کہ کسی انسان کی کارگزاری کو اس میں دخل نہیں ۔ لوہے کے ٹکڑے خود آئے مجتمع ہوئے اور ایک خاص شکل میں مرتب ہوگئے۔ کوئلہ اپنے معدن کی تہہ سے نکلا۔ یہاں پہنچا اور مشین کے اندر چلا گیا۔ پانی سمندر سے کھینچ کر آیا اور اس میں بھر گیا۔ پھر آگ خود ہی دہکی ۔ دھواں بلند ہوا اور مشین متحرک ہوگئی۔

وہ کہے اور بہت زور دیکر سمجھانا چاہے مگر آپ اس کا کبھی یقین نہ کیجئے گا۔ آپ تین اور تین کا مجموعہ سات تسلیم کر لینا آسان سمجھیں گے۔ اس سے کہ ایک چلتی ہوئی مشین کام کرتے ہوئے انجن متحرک پرزے کو بغیر کسی ذی شعور محرک کے ساتھ تعلق کے تسلیم کریں۔یہ کیوں؟ اس بناء پر کہ ان میں اغراض و مقاصد مضمر ہیں اور ان ہی کے لحاظ سے ان میں توازن و تناسب قائم ہے ۔ اگر یہ مشینیں اس طرح کی ہوتیں کہ ان کے اجزاء بے ترتیب ہوتے ۔ نہ کوئی ربط ہوتا اور نہ کوئی مناسبت تو آپ تسلیم بھی کرلیتے کہ یہ اجزاء خود ہی مجتمع ہوگئے ہیں مگر چونکہ ان میں اغراض و مقاصد کے لحاظ سے ترتیب قائم ہے اور مخصوص فوائد مضمر نظر آتے ہیں اس لئے آپ سمجھتے ہیں کہ ان کا کوئی موجد تھا جو مناسبتوں سے واقف تھا۔

اور صناعی پر قدرت رکھتا تھا ۔ اسی نے ان کو ایجاد کیا ہے۔ پھر جب ہر چیز میں یہ اصول قائم ہے تو اس مجموعہ عالم کائنات میں آپ اس اصول سے منحرف کیونکر ہوسکتے ہیں۔ آپ اس عالم پر غور کیجیۓ۔ دیکھئے ۔ اگر اغراض و مقاصد ملحوظ نہ ہوں اور ضروریات کے لحاظ سے کائنات میں توازن و تناسب نہ قائم ہوتو نہ تسلیم کیجئے کہ اس کا خالق ذی شعور اور صاحب اقتدار ہی ہو سکتا ہے۔لیکن اگر اس عالم کی چیزوں میں اغراض و مقاصد کے لحاظ سے تناسب پایا جاتا ہے تو پھر آپ کو ہمارا ہم آواز ہونا چاہئے

کہ ضرور ان کا کوئی خالق ہے جو شعور و اختیار کا مالک ہے ۔ چاہے اسے دیکھا نہ ہو مگر سمجھ لینا چاہیئے کہ کوئی ہے ضرور ۔

☆☆☆☆☆

نظام ایجاد

آپ اس دنیا کا جائزہ لیجئے تو آپ کو اس میں ترتیب و نظام نظر آئے گا طبیعات سے متعلق جتنے علوم و فنون ہیں ان سب کی بنیاد کائنات کے قائم شدہ ترتیب و نظام پر ہے ورنہ اگر دنیا سے ترتیب و نظام ختم ہو جائے تو نہ علم النباتات کچھ ہے ، نہ علم الحیوانات نہ علم معاون نہ علم خواص الاشیاء وغیرہ وغیرہ ۔سائنس کے تمام شعبے ختم ہو جائیں۔یہ آپ کے جتنے علوم ہیں سب مبنی ہیں فطرت کے نظام ارتباط اور ترتیب پر بلکہ یہ علوم صرف نام ہیں ۔

اس ترتیب کے سمجھنے کا جو مختلف قسم کے اشیاء میں پائی جاتی ہے۔ جتنا اس ترتیب کو آپ زیادہ سمجھتے جاتے ہیں اتنا اپنے علم کو کامل تر خیال کرتے جاتے ہیں ۔ واقعی بے انصافی ہے کہ ہم ایک ایسے گہرے نظام کو جس کے اسرار و رموز پر غور کرنے میں گزشتہ ہزاروں برس میں عقلاء و مفکرین کی عقلیں صرف ہوئیں اور آج تک ہمارا دماغ اس میں کسی آخری نقطہ تک نہیں پہنچا ہے۔ اور بہت سے اسرار ہیں جو اب تک سمجھ میں نہیں آئے ہیں۔ ایسی ترتیب اور ایسے نظام کو ہم غیر ذی شعور غیر ارادی بے حس مادہ یا طبیعت کے حوالہ کر دیں۔

☆☆☆☆☆

صناعی کی مثالیں

صنعت ہر زمانہ میں رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آج کل صناعی میں ترقی بہت ہو گئ ہے۔ مگر صنعتوں کا وجود پہلے بھی تھا۔ یہ دیکھیئے دروازہ اس کے پٹ اور چوکھٹ بازو۔ اس میں قبضے لگے ہیں۔ یہ دو لوہے کے ٹکڑے ایک دندانہ دار صورت پر بنائے گئے ہیں۔ بیچ میں ایک سلاخ لگادی گئ ہے جو ان دونوں میں ارتباط پیدا کردے قبضے اگر لوہے کے ٹکڑے سے ڈھلے ہوئے ہوتے تو جب دروازہ اور چوکھٹ بازو میں جڑ دیے جاتے تو دروازہ بھی جڑ جاتا۔

نہ کھل سکتا اور نہ بند ہوسکتا اور اگر دو لوہے کے ٹکڑے ہوتے الگ الگ جن میں کوئی جوڑ نہ ہوتو دروازہ دیوار سے الگ رہتا۔ مکان میں نہ لگ سکتا لیکن جب دو ٹکڑے ہوئے ۔ ان کے درمیان خاص طور سے ایک لوہے کی سلاخ کے ذریعہ سے وصل کیا گیا جس کی وجہ سے وہ دو ہونے کے ساتھ ایک ہوگئے ۔ اب ان کے ایک حصہ کو بازو کے ساتھ جڑ دیا جاتا ہے۔

دوسرے حصہ کو دروازہ کے پٹ سے لگایا جاتا ہے۔ اس طرح دروازہ مکان میں لگ بھی جاتا ہے الگ نہیں رہتا اور پھر وہ درمیانی لوہے کی سلاخ محور بن کر اسے کھولنے اور بند کرنے کا موقع دیتی ہے۔ جب چاہیں وہ کھل جاتا ہے اور جب چاہیں بند ہوجاتا ہے ۔ یقیناً غایت و مقصد کے لحاظ سے یہ ترتیب بتلاتی ہے کہ سمجھدار صناع کی ایجاد ہے اور سابق زمانہ کے لوگوں کی ذہانت کا نتیجہ۔مگر کیا انسان کے جسم میں یہی چوکھٹ بازو اور دروازہ کی صنعت زیادہ مکمل طور پر موجود نہیں ہے؟یہ جوڑ بند اور مفاصل۔ یہ ہڈیاں ہیں۔ ان کا جوڑنا مقصود یہ اگر بالکل الگ الگ رہیں اور ان میں ربط قائم نہ ہوتو یہ

ہاتھ کہنی کے نیچے سے یونہی جھولتا رہے گا۔ قابو میں نہیں آسکے گا اور اگر ان کو جوڑ دیا جائے بازو کی ہڈی میں تو یہ ہاتھ کھلے کا کھلا رہ جائے گا یا بند کا بند رہ جائے گا۔جس طرح اگر شروع سے آخر تک یہ ہاتھ اگر مسلم استخوان سے بنا ہوا ہوتا تو اٹھنا بیٹھنا اور کام کرنا کسی صورت سے ممکن نہ ہوتا۔ مگر ذرا دیکھیئے تو کہ یہ کس ترکیب سے ملائے گئے ہیں ۔

ان ہڈیوں کے آخری سرے ایسے دندانوں کی شکل میں ہیں جو آپ قبضوں کے دونوں پہلوؤں میں دیکھتے ہیں ۔ اجتماع کے وقت دونوں طرف کے دندانے ایک خاص متحدہ صورت سے اس طرح ملتے ہیں کہ جدائی باقی نہیں رہتی۔ یعنی ہر طرف کے درمیانی شگاف میں دوسری طرف کا بلند حصہ داخل ہوکر متحدہ شکل پیدا کر دیتا ہے۔مگر ان دونوں کے ربط کے واسطے درمیانی سلاخ کا ہونا جیسا کہ قبضوں میں ہوتا ہے ہاتھ کے رکھنے ٹیکنے اور دیگر اعضاؤ جوارح میں خاص خاص ضروریات زندگی میں حارج ہوتا اس لئے ان اعضاء میں ارتباط کے لئے باریک باریک رگیں بچھائی گئیں اور جلد کا غلاف چڑھایا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنانے والے کو پہلے سے معلوم تھا کہ اس مخلوق کو کس طرح کے ضروریات پیش آئیں گے۔

پھر اگر غلاف جلد کا تنگ ہوتا تو ہاتھوں پیروں کے سمیٹنے کی حالت میں جلد میں وہ کھنچاؤ پیدا ہوتا کہ کسی طرح بند کرنا اور سمیٹنا ممکن نہ ہوتا۔مگر کیا کہنا اس صناع کا جو ان تمام حالات پر مطلع تھا۔ اس نے جہاں جہاں جوڑ ہیں وہاں پر کثیر التعداد شکنیں چنٹیں دیدی ہیں کہ جس وقت ہاتھ پاؤں کھولا جاتا یا پھیلایا جاتا ہے۔ وہ چنٹیں مجتمع ہو جاتی ہیں اور جب اسے بند کیا اور سمیٹا جاتا ہے تو وہ چنٹیں کھینچ کر ایک تی ہوئی شکل میں ہو جاتی ہیں۔پھر کوئی شکن باقی نہیں رہتی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے

کہ شکنیں مقدار ضرورت کا اندازہ کرکے رکھی گئی ہیں نہ اس سے زیادہ ہیں نہ اس سے کم۔آپ آلہ عکاسی فوٹوگرافی کی مشین کو ملاحظہ فرماتے ہیں۔ تعریف کرتے ہیں اور ضرور قابل تعریف ہے۔ ایک بند اور محدود صندوق کے اندر ایک ایسا شیشہ ہے جو سامنے کی ہر چیز کا عکس لے لینے کے قابل ہے۔وہ عکس لیتا ہے اور خاص صورتوں سے اسے محفوظ بھی کرلیتا ہے اور پھر دواؤں کے ذریعہ سے اسے صفحہ کاغذ پر منتقل بھی کر دیتا ہے ۔

ایجاد ہے اور بہت اچھی ایجاد اور آپ کہئے گا کہ اس کا موجد بڑے دماغ اور ذہانت کا انسان تھا۔ میں آپ کے ساتھ اس امر پر متفق ہوں ۔مگر جب آپ اتنی صنعت کو ایک عقل اور شعور والے صناع کی طرف نسبت دیتے ہیں تو اگر آپ کے جسم میں یہ اس سے زیادہ مکمل صورت پر موجود ہوتو اسے طبیعت کی کرشمہ سازی اور اجزاء مادہ کی غیر ارادی حرکت کا نتیجہ قرار نہ دیجئے۔

موجودہ آلات عکاسی میں کتنی کمزوریاں ہیں۔جس رخ پر آپ نے ان کے شیشہ کو لگا دیا ہے۔ جب تک آپ ہی انھیں دوسرے رخ پر نہ لگائیں وہ ادھر مڑ نہیں سکتے۔ ایک شیشہ پر جب ایک تصویر آگئ تو جب تک وہ تصویر محو نہ ہو یا اسے دھویا نہ جائے اور شیشہ بالکل صاف نہ کیا جائے۔ دوسری تصویر پھر اس شیشہ پر نہیں آسکتی۔

شیشہ تصویر کو اپنے قدوقامت کے مطابق لیگا۔ اگر چھوٹا شیشہ ہے تو چھوٹی تصویر آئیگی چاہیے وہ چیز بڑی ہو۔ اور بڑا شیشہ ہوتو بڑی تصویر لے گا۔ چاہیے وہ چیز چھوٹی ہو۔ اس کے معنی ہیں کہ اس کی واقعی مقدار ظاہر نہ ہوگی۔ لیکن اب میں آپ کو ایسا آلہ عکاسی بتلاؤں جسے بنانے والے نے ایک بلند

جگہ رکھا ہے۔تاکہ دور دور کی چیزوں کا آسانی سے تقابل ہوسکے۔ اس میں دروازے لگائے ہیں۔ جس کے پٹ بند ہوتے اور کھل جاتے ہیں تاکہ گردو غبار سے شیشے خراب نہ ہوں اور ان میں چلمنیں لگائی ہیں جو دروازوں کے کھلے ہونے کی حالت میں اٹھتی اور گر پڑتی ہیں ۔

اس میں ایک ایسی کل لگائی گئی ہے جس سے وہ شیشے چاروں طرف گھوم کر ہر طرف کے عکس لیتے رہتے ہیں یہ شیشے ایک عکس کو لیکر بیکار نہیں ہوجاتے نہ ان کے بدلنے کی ضرورت پڑتی ہے نہ دھونے صاف کرنے کی حاجت ہوتی ہے بلکہ خود ان میں یہ خاصیت ہے کہ صورت کو لیں بھی اور پھر سادہ بھی رہیں اور وہ صورت محو بھی نہ ہو بلکہ فورا ایک خزانہ میں منتقل ہو جائے۔جہاں وہ محفوظ رہے اور جب انسان چاہے وہ تصویر اس البم سے نکل کر پھر اس کے پیش نظر ہو جائے وہ شیشے ہر وقت تصویریں لیتے اور پھر ہر وقت سادہ اور دوسری تصویر لینے کے لئے آمادہ ہیں۔

ان کی تصویر اگر شرائط مقابلہ کے اعتدال کے ساتھ ہے تو اتنی ہی بڑی ہوتی ہے جتنی اصل اس شئے کی مقدار ہے چاہے وہ بڑی سے بڑی چیز کی صورت ہو اور چاہیے چھوٹی سے چھوٹی چیز کی۔ بہر حال اس کی اصلی مقدار محفوظ رہتی ہے یہ آلہ عکاسی کوئی اور نہیں۔ نظر اٹھائیں دیکھئے تو آپ کی دونوں آنکھیں ہی ہیں۔انھیں کانسئہ سر میں جگہ دی گئی ہے ۔

جو عمارت جسم کا بلند طبقہ ہے تاکہ دور کی چیزوں کا باآسانی مقابلہ ہوسکے۔ ان کے لئے پپوٹوں کے دروازے قرار دیے گئے ہیں جو بوقت ضرورت کھلتے اور بند ہوتے ہیں ۔ ان کے لئے پلکوں کی علمچنیں بنائی گئی ہیں۔ جو اٹھتی اور گر پڑتی ہیں۔ ان کو گردش کی طاقت دی گئی ہے کہ یہ چاروں

طرف کے نقشوں کو لے سکے اور پیش نگاہ کر سکیں۔ان دونوں آنکھوں میں عجب اتحاد عمل قرار دیا گیا ہے کہ ہیں دو مگر صورت جس کا احساس ہوتا ہے ایک ہے اور وہ دونوں اس صورت کو لیکر جس مشترک اور پھر حافظہ کہ خزانہ میں منتقل کر دیتی ہیں اور خود دوسری صورتوں کے اور اک کے لیے سادہ رہتی ہیں وہ اپنی مختصر ہستی کے باوجود بڑے سے بڑے پہاڑ ، دریا، سمندر، کی تصویر لیتی اور اسے اتنا ہی دکھلاتی ہیں جتنا وہ ہے۔ ان کے محسوسات کا چھوٹا بڑا ہو جانا شرائط روایت کے عدم اعتدال کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

وہ فقط اپنی عکس گرفتہ صورت کی ظاہری شکل اور ہندسی مقدار ہی کو نہیں دکھلاتی بلکہ اس کے رنگ روپ حرکت اور سکون کو بھی اصلی طور پر پیش کرتی ہیں جس میں اختلاف نہیں ہوتا۔ یہ ہے ایک انسان کو دیکھتی ہوئی آنکھ۔ یہ ہے وہ آلہ عکاسی جس کی مثال دنیا کی طاقتیں پیش نہیں کر سکتیں۔میں سچ کہتا ہوں کہ اتنا نازک شیشہ نہیں ہوسکتا۔ جتنا آنکھ کا پردہ نازک ہے۔ مگر قدرت نے اس کی حفاظت کے لئے عجب سامان رکھا ہے آپ ملاحظ تو کیجئے ایک بھرے بازار میں جہاں ہجوم زیادہ ہو ایک شیشہ کا گلاس ہتھیلی پر رکھ کر لے تو جائیں۔

دیکھئے گا کہ اس کا بچنا ایک بالکل غیر معمولی چیز ہے۔مگر حوادث عالم میں انسان نہ معلوم کتنی مرتبہ گزرتا ہے۔ کتنی چوٹیں لگتی ہیں اور کتنی سخت چیزوں کا مقابلہ ہوتا ہے ۔ مگر شاذ و نادر وہ صورتیں ہوتی ہیں کہ آنکھ پر ضرب آ جائے۔ یہ صرف قدرت کی طرف کا سامان ہے۔ خطرناک چیز آنکھ کے سامنے آئے گی تو غیر ارادی طور پر پپوٹے بند ہو جائیں گے۔اسی طرح انسان کے اعضاؤ جوارح میں سینکڑوں صنعتیں مضمر ہیں جو علم تشریح میں ظاہر ہوئی ہیں ۔ اور اب تک تحقیقات سے منکشف ہوتی

جاتی ہیں ۔ یہ بالکل کھلی ہوئی دلیل ہے اس کی کہ یہ نظام کسی صاحب دانش ہستی کا قائم کیا ہوا ہے۔اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا کہ اگر یہ دنیا کسی ذی شعور و صاحب اختیار شخص کی کارکردگی کا نتیجہ نہیں ہے تو پھر اس میں اغراض و مقاصد کی تلاش کیوں ہوتی ہے۔

وہ لوگ جو دنیا کو نشو و ارتقائے طبعی کا نتیجہ مانتے ہیں وہ خود ارتقاء کے ثبوت میں اس طرح استدلال پیش کرتے ہیں کہ ہم بعض حیوانات کے اعضاء میں بعض چیزیں ایسی پاتے ہیں جن سے اس نوع کو کوئی فاہدہ نہیں پہنچ سکتا ۔ جیسے انسان اور بعض جانوروں میں نہ کورکے کے سینہ پر نشانات ، حالانکہ اس کا فائدہ صنف اناث سے مخصوص ہے اور ذکور کے لیے ان کا کوئی فائدہ نہیں ہے ۔

اسی طرح آنتوں میں بعض حصے اور اسی طرح کے بعض دوسرے اجزاء جن کا کوئی فائدہ اس نوع کی زندگی میں نہیں ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعضاء کسی گزشتہ نوع کے پسماندہ آثار میں جو ان اعضاء سے مستفید ہوئی تھی ۔اور اس کے نظام زندگی میں ان اعضاء کو مداخلت حاصل تھی اب ترقی کر کے نوع بدل گئی اس لیے ان اعضاء کی ضرورت جاتی رہی مگر آثار ان کے باقی ہیں ۔

یہ استدلال صاف بتلاتا ہے کہ کہنے والا اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ جسم حیوانی کے ہر جزو کا کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور ہے اس لیے اگر ڈھونڈنے پر کوئی فائدہ نہیں ملتا تو یہ رائے قائم کرتا ہے کہ ضرور اس کے پہلے کوئی مخلوق ہوگی جو اس جزو سے فاہدہ اٹھاتی ہوگی اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ تسلیم شدہ چیز ہے کہ عالم کائنات میں ہر چیز کسی مصلحت اور مقصد سے ہے ۔مگر یہ بالکل عجیب بات ہے کہ ایک سانس میں دنیا کی ہر چیز کو فائدہ و مقصد کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے اور دوسری سانس میں ان

تمام چیزوں کو بے حس و بے شعور طاقتوں کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے اور ان کے لیے کسی بااختیار فاعل کی کارکردگی کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ یہ بھی تو ملاحظہ کیجئے کہ انسانی جسم میں اعضاءوجوارح کتنے ہیں ؟ عردق و شرائین ، اعصاب و عضلات سب کو شمار کیا جائے تو ایک دنیا ہے جو موجود ہے ۔ ان میں ڈھونڈنے کے بعد صرف دو چار چیزیں ایسی بتلائی جاتی ہیں کہ جن کا کوئی فائدہ اس نوع میں ظاہر نہیں ہوتا۔ مثلاً آنتوں میں ایک بڑھا ہوا ٹکڑا جس کو عربی میں معااعور کہتے ہیں یا کان کے بعض حصے یا سینہ پر کے نشانات ۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ فیصد 98چیزوں کے انسانی اجزاء میں فوائد دریافت ہو گئے ہیں اور صرف یہ دو ایک چیزیں رہ گئی ہیں جن پر زور دیا جاتا ہے کہ ان کا کچھ فائدہ نہیں ہے ۔مگر یہ انصاف آپ کے ہاتھ ہے کہ فیصدی 98 چیزیں جن کے مقاصد و فوائد سمجھ میں آگئے معیار بننے کے قابل ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے گا کہ ان کا موجد عقل و شعور کا مالک ہے یا فیصدی دو چیزوں کو معیار بنا کر اس کے عقل و شعور کی نفی کی جائے ۔

پھر یہ فیصدی 98 باتیں بھی جن کے اصل رموز بقول آپ کے آپ کی سمجھ میں آگئے ہیں یہ بھی تو ایک ہی دفعہ آپ کو معلوم نہیں ہوگئے بلکہ بہت باتیں تھیں جو سو برس پہلے آپ کو نہیں محلوم تھیں۔ اس کے بعد معلوم ہوئیں اور یوں ہی تدریجی حیثیت سے ان تمام باتوں کا علم حاصل ہوا ہے پھر اب آپ کیوں نا امید ہو گئے ہیں کہ جو چیزیں باقی رہ گئی ہیں ان کے اسرار و رموز کا علم آپ کو مستقبل میں حاصل ہو گا۔ پھر یہ آپ قطعی حکم کیسے لگاتے ہیں کہ اس جزو کا اس نوع میں کوئی فائدہ نہیں ہے ۔

کائنات عالم کی مصلحتیں عقلائے زمانہ کے لیے برابر منکشف ہوتی جاتی ہیں اور میں سچ کہتا ہوں کہ جتنی دنیا ترقی کرے گی اور آگے بڑھی گی اتنے دلائل وجود خدا زیادہ پیدا ہوتے جائے گے اور عقل انسانی خدا کی معرفت سے قریب ہوتی جائے گی۔

☆☆☆☆☆

کائنات پر مجموعی حیثیت سے نگاہ

اس عالم کے اجزاء کو ایک دوسرے پر مبنی ہونے ہی کی حیثیت سے اگر دیکھا جائیگا تو سلسلہ طولانی ہو گا اور منزل دور ہو جائیگی۔ حالانکہ نتیجہ پھر وہی ہو گا اس لئے اس تمام کائنات کو ایک مجموعہ کی صورت میں خیال کیجئے اور اس مجموعہ کے متعلق اس پر غور کیجئے کہ یہ بذاتِ خود وجود کا متقاضی ہے یا نہیں۔ اگر یہ اپنی ذات کے ساتھ وجود کا حقدار اور اس کا متقاضی ہوتا تو ہمیں اس میں ناپائیداری، بے ثباتی، تغیر انقلاب نظر نہ آتا۔ اس لئے کہ یہ عالم تمام و کمال وجود کا تقاضا رکھتا ہے اور جو شئے ذاتی تقاضے سے ہوتی ہے وہ ذات سے جدا نہیں ہو سکتی۔

اگر وجود اس کے لوازم ذات سے ہوتا تو اس میں عدم کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ پھر اس عالم کی کسی شئے کے بھی تصور کے وقت یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ وہ ہے یا نہیں۔ کیونکہ سوال کی صورت تو اس وقت ہو جب دونوں پہلو یکساں حیثیت سے محل رکھتے ہو یعنی ہونا بھی گنجائش رکھتا ہو اور نہ ہونا بھی گنجائش رکھتا ہو۔

یقیناً اگر وجود اجزائے عالم میں بحیثیت ذات ہوتا تو ان کا تصور ان کے وجود کا پتہ دینے کے لئے کافی ہوتا کیونکہ ہستی تو خود ان کی ذات میں مضمر ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ ہر شئے کا جب ہم تصور کرتے ہیں تو پہلے وہ شئے ذہن میں آتی ہے، پھر ہماری عقل مصروف جستجو ہوتی ہے کہ آیا یہ موجود ہے یا نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی

ہر چیز ذاتی حیثیت سے وجود و عدم کی طرف یکساں نسبت رکھتی ہے۔ نہ کوئی خاص تعلق اس کے وجود کے ساتھ ہے نہ کوئی خاص رشتہ عدم کے ساتھ۔

پھر جب بذاتِ خود اس میں کسی ایک بات کا بھی تقاضا نہیں ہے تو اس میں وجود کو عدم پر ترجیح کیونکر ہوتی ہے۔ یقیناً اس کے لئے کوئی خارجی سبب ہونا چاہئے جس کے ذریعہ سے عالم وجود میں آئے اور وہ خارجی سبب ایسا ہو کہ جس کی ذات ہی میں وجود مضمر ہے۔ اسی کو واجب الوجود کہتے ہیں۔ اور وہی اس تمام عالم کائنات کا خالق ہے۔

☆☆☆☆☆

ہستی کے لئے مرکز کی ضرورت

دنیا میں ہر چیز اپنے مرکز کا پتہ دیتی ہے۔ مثلاً ایک خوردہ فروشی کی دکان پر آپ تشریف لے جائیے وہاں منفرق چیزیں نظر آئینگی تھوڑا سا کاغذ رکھا ہوا ہے، کچھ قلم رکھے ہوئے ہیں، کچھ دواتیں رکھی ہوئی ہیں۔ کچھ قفل رکھے ہوئے ہیں۔ یہ بساطی کی دوکان ہے۔ آپ غور کرتے ہیں تو یہ تمام چیزیں آپس میں کوئی احتیاج نہیں رکھتی ہیں یعنی کاغذ کو قلم کے ساتھ ان دونوں کو دولت کے ساتھ۔ ان تینوں کو قفل کے ساتھ کوئی ایسا تعلق نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے یہ چیزیں ایک ساتھ ہی ہوں تو ہوں۔

اس لئے آپ کی عقل طے کرتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا اصل مخزن دوسرے سے علیحدہ ہے جہاں سے تھوڑی تھوڑی مقدار میں آکر یہ مجتمع ہو گیا ہے اور ان میں سے ہر شئے کو اس کے کلی وجود یا مرکز اجتماعی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس میں دوسری چیز اس کو شریک نظر نہ آئیگی۔ پیپر مل میں کاغذ ہی کاغذ ہو گا۔ قلم نہ ہونگے۔ قلم کے اصل کارخانہ میں کاغذ نہیں ہو گا۔ دواتوں کے اصل مرکز میں قفل نہیں ہونگے اور علی ہذا القیاس۔ یہ ان سب کہ

جزئی وجود کا نتیجہ تھا کہ وہ دوسری چیزوں کے ساتھ مخلوط ہوگئے ورنہ ہر ایک بذاتِ خود ایک الگ مرکز رکھتا ہے جہاں وہی وہ ہے اس کا غیر نہیں ہے۔ دوسری مثال موالید ثلمثہ عناصر سے مرکب ہیں۔ ہوا، پانی، آگ، مٹی۔ ان سب کے اجتماع سے ایک سموئی ہوئی کیفیت پیدا ہوئی۔ یہ سموئی ہوئی کیفیت ان کے اجتماعی شکل کا نتیجہ ہے۔

لیکن ان میں ہر عنصر اپنے لئے ایک مرکز رکھتا ہے اور وہ اس کا مستقل وجود ہے ان میں سے ہر جزو اپنے اس کل کا پتہ دیتا ہے اور اس کل میں پھر دوسرے عناصر کی شرکت نہیں ہو سکتی۔ دنیائے کائنات میں جب ہم نے جائزہ لیا تو ہمیشہ وجود و عدم ساتھ ساتھ ہے۔ ہستی و نیستی ہمعناں دکھائی دی یعنی ہر شئے میں ہستی کا پہلو بھی ہے نسیتی کا بھی لیکن جب ہم ذات ہستی پر غور کرتے ہیں تو وہ نسیتی کی محتاج نہیں ہے اور نہ نیستی ہستی کی پابند ہے۔ اس کے لئے جب ہم عقل پر زور دیتے ہیں تو ہمیں ایسی نیستی کا پتہ ملتا ہے جہاں ہستی شریک نہیں ہے اور وہ محلات ہیں۔

ایسے عدم کا اصل مرکز سمجھنا چاہیے لیکن اب اس دوسرے جزو کے لئے بھی مرکز تلاش ہونا چاہئے یعنی ایسی ہستی کہ جس میں نیستی کا رگزر نہ ہو۔ اس کا نام ہے واجب الوجود جس کہ ساتھ عدم کسی طرح شریک نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

نقائص کی سرحدوں سے لامحدود کمال کا سراغ

جب ہم کائنات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو وجود کے ساتھ نقائص نظر آتے ہیں اور ان نقائص کے لحاظ سے ہم مختلف ماہیات و طبائع میں ان اشیاء کو مندرج کرتے ہیں مثلاً ہم کو ایک درجہ وہ ملتا ہے جہاں شئے اپنے اجزا کو محفوظ رکھتی ہے یعنی اپنے وجود کو سنبھال لیتی ہے مگر پھر اس کو بڑھا نہیں سکتی اور ترقی نہیں کر سکتی۔ اس کا نام ہے جماد پھر وہ درجہ ہے جہاں شئے کی ہستی محفوظ بھی رہتی ہے اور پھر اس میں اضافے کی بھی صلاحیت ہے اور ترقی بھی ہوتی ہے

جس کا نام ہے نشو و نما۔ اس قسم کا نام ہوا نباتات۔ اس کے بعد وہ چیزیں آئیں جن میں حس و شعور پایا جاتا ہے۔ یہ ہوئے حیوانات اور اس کے بعد وہ منزل ہے جہاں معلومات سے مجہولات کے پتہ لگانے اور علمی و عملی ترقیوں کی صلاحیت ہے اس کا نام ہے انساں۔ آپ غور فرمایئے تو یہ مختلف طبائع کی تفریق اور مختلف انواع کی تشکیل صرف ان مدود و قیود سے ہوئی ہے جو وجود کے ساتھ منضم ہوئے ہیں۔ مثلاً جماد کیا ہے۔ وہ جو اپنے اجزاء کو مجتمع رکھتا ہے اور بس اس بس کے مفہوم سے نوع جماد کی تشکیل ہوئی ورنہ وجود تو ان سب میں پایا جاتا ہے۔ یہ بس کیا ہے۔ ایک حد اور قید ہے جو وجود پر عائد ہوئی۔ پھر آگے بڑھے۔ آپ نے کہا نشو و نما کی طاقت ہے اور بس اس بس سے نوع نباتات کی تشکیل ہوئی۔

یوں ہی اس کے آگے بڑھے اور حس و حرکت ارادی کی حد قائم کی تو حیوان اور عقل کی حد قائم کی تو انسان کی نوع تیار ہو گئ۔ وہ چیز جو ان میں مشترک ہے جسمیت وہ خود حد اور پابندی کا نام ہے یعنی طول اور عرض اور عمق میں قابل انقسام ہونا جس کا لازمی نتیجہ ہے مکان اور چیز کی احتیاج۔ یہ حد نقص ہے جس نے وجود کے ساتھ مل کر اسے جسم بنادیا اور یہ نقص تمام جسمانی اشیاء میں عمومیت کے ساتھ پایا جانا ضروری ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ عالم کائنات جو مختلف طبائع و ماہیات پر منقسم ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ حدود و جودات کا مجموعہ! یہ حدیں آتی کہاں سے ہیں؟ عدم کی طرف سے یعنی جہاں پر سے کمال نے ساتھ چھوڑا اور اس کے آگے کچھ نہیں کی صدا آئی وہیں سے ایک نوع تیار ہو گئی۔

مگر یہ حدود لگائے کاہے میں جاتے ہیں؟ وجود میں۔ یہ عالم کائنات صرف ان حدوں کا نام ہے جو وجود کے ساتھ لگائی جاتی ہیں۔ اب یہ وجود کہاں سے آتا ہے؟ ان حدود سے نہیں اس لئے کہ وہ تو عدمی پہلو ہیں جو وجود کے ساتھ ملحق ہوتے ہیں۔ اس کے لئے یقیناً ایک اصل وجود ماننا ضروری ہے جس میں کوئی حد و قید نہ ہو۔ اسی وجود غیر محدود یا

کامل ہستی کا نام واجب الوجود ہے۔ حدوث وامکان اس نیستی کی شرکت کا لازمی نتیجہ ہے جو محدود ہونے کے ساتھ وجود میں پیدا ہوتی ہے اور جب وجود غیر محدود ہے تو اس میں ہستی ہی ہستی ہو گی۔ نیستی کا پتہ نہ ہو گا اس لئے اس میں کوئی وقت ایسا فرض بھی نہ کیا جاسکے گا جس میں وہ معدوم ہو یا معدوم ہو سکے۔

یوں سمجھئے کہ کائنات کی محدود ہستی میں اسی نقص کی بناء پر جو حد بندی سے پیدا ہو گیا ہے احتیاج کی صفت آگئی ہے اور احتیاج خود محتاج الیہ کا پتہ دیتی ہے۔ جب کائنات کی تمام چیزوں میں ہم کو احتیاج نظر آرہی ہے تو ایک مرکز استخناء ماننا ضروری ہے جو اس تمام کائنات کے واسطے معدن فیض قرار پائے اور ان تمام محتاج چیزوں کو اسی کے کمال سے حصہ رسدی کمالات کی دولت حاصل ہو۔ اسی غنی بالذات ہستی کو واجب الوجود کہتے ہیں۔ وہی خدا ہے۔

☆☆☆☆☆

ذیحیات مخلوق سے ذیحیات خالق کا پتہ

عالم کے جتنے موجودات ہیں ان میں اگر صرف جسمانیت ہوتی اور جسمانیت کے خواص طبعی حرکت و سکون اور اجتماع وافتراق یہ مادہ کے خواص ہیں۔ یہی چیزیں اگر دنیا کائنات میں ہم کو نظر آتیں تو پھر شائد ہم مان لیتے کہ ان کا باعث صرف مادہ ہے لیکن کائنات کی کسی ایک قسم میں بھی حس و شعور کا ہونا اور ارادہ واختیار کے جوہر کا پایا جانا یہ بتلاتا ہے کہ اس کے مبادی و اسباب میں کہیں نہ کہیں عقل و شعور کی طاقت مضمر ہے کیونکہ فرع اصل سے زیادہ نہیں ہو سکتی اور ایک شئے میں کوئی بات جب خود نہیں ہے تو وہ دوسرے کو عطا کیسے کر سکتی ہے؟

آگ گرم ہے، پانی کو گرم کرے گی۔ برف سرد ہے خشکی بخشے گی لیکن کوئی شئے خود گرم یا سرد نہ ہو اور وہ دوسرے میں یہ صفتیں پیدا کر دے۔ غیر ممکن ہے۔ کسی نہ کسی طور سے اس خاصیت کا مضمر ہونا ضروری ہے خواہ وہ حسی

حیثیت سے نہ ہو طبعی حیثیت سے ہو۔ اسی طرح کائنات میں عقل شعور ارادہ واختیار کا ہونا۔ ہر گز اجازت نہیں دیتا یہ کہنے کی کہ اس کا سبب اصلی بالکل عقل و شعور کی صفت سے خالی ہے۔

پھر چونکہ سلسلہ اسباب کا دور تک ہے لیکن آخر میں وہ مبداء اول پر منتہی ہوتا ہے۔ اور درمیانی سلسلہ میں عقل و شعور کا پتہ نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو کیا فائدہ کیونکہ سوال پیدا ہو گا کہ اس درمیانی سلسلہ میں یہ جوہر کہاں سے آیا۔ اس لئے ضرورت ہے یہ مانا جائے کہ مبدأ اول عقل و شعور اور ارادہ واختیار کا مالک ہے اور اسی نے اپنے مخلوقات میں جس کو چاہاہے یہ صفت عطا کی ہے۔

☆☆☆☆☆

معرفت خدا کے طریقے

خدا کی معرفت کے لئے بہت سے ذرائع بتلائے گئے ہیں اور ایک فلسفی نے یہاں تک کہاں ہے کہ خدا کی معرفت کے راستے بعبرو نفاس بشر ہیں یعنی جتنی سانسیں انسان لیتا ہے اتنے ذریعہ معرفت باری کے ہیں۔ لیکن مسلک کی حیثیت سے مختلف جماعتوں نے جو مختلف راستے اختیار کئے ہیں وہ تین ہیں۔ پہلا مسلک باطنیہ کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل کہ ذریعہ سے خدا کی معرفت حاصل نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ اپنی زمانہ میں ایک انسان تلاش کر لینا چاہیئے۔

اسی کہ ذریعہ سے خدا تک پہنچنا چاہیئے ۔ یہ طریقہ خداوند عالم کی اجمالی معرفت کے بعد اس کے صفات جمال و جلال کی تفصیلی واقفیت میں تو قابل قبول ہوسکتا ہے مگر اصل اس کہ وجود کی تصدیق اور اجمالی معرفت کے لئے اس طریقہ کو معین کرنا بالکل غلط ہے ۔اس لئے کہ اگر عقل کا قدم

درمیان سے نکال دیا گیا تو اس مرشد کامل کی شناخت اور اس کے قول پر عمل کرانے ہی کا کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ آخر ہم تلاش کیوں کریں اور مرشد کے پاس کیوں جائیں اور اس کی بات کیوں سنیں اور اس پر عمل کس لئے کریں۔

یہ سب باتیں تو عقل کہ ساتھ ہیں۔دوسرا مسلک عرفاؔ صوفیہ کا ہے۔ وہ ریاضت نفس اور جلائے باطن کہ بعد کشف و اشراق کے ذریعہ سے خدا کی معرفت حاصل کرنے کے مدعی ہیں ۔اس میں بحث کرنا ہی بیکار ہے کیونکہ وہاں دلیل ہے تو کوئی سروکار نہیں ۔ بہرحال یہ طریقہ منکر اور جاہل کے لئے کچھ مفید نہیں۔ جس کے واسطے کشف ہوگیا اس کے لئے بس ہوگیا لیکن جو اس اشراق سے محروم ہے اس کو ہم ماننے کی دعوت کیسے دے سکتے ہیں ۔جسٹس کرامت حسین صاحب ، آپ کے یہاں ایک فلسفی کی حیثیت رکھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ خدا کی معرفت فطرت سے متعلق ہے اور وجدانیات میں سے ہے۔ یعنی بھوک جس کو لگی ہو بس وہی بھوک کو سمجھ سکتا ہے۔

لیکن اگر بفرض محال کسی کو بھوک لگے ہی نہیں تو اسے سمجھایا نہیں جاسکتا کہ بھوک کیا چیز ہے۔ ویسی ہی خدا کی معرفت ہے اس کا بھی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو شخص خدا کو نہیں مانتا وہ قابل الزام نہیں ہے ۔ اور نہ کسی طرح اس کو قائل کیا جاسکتا ہے ۔تیسرا طریقہ حکماء کا ہے ۔ یہ دلائل و براہین کے ذریعہ سے خدا کے وجود کو ثابت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اہل عقل کے لئے یہی واحد طریقہ سمجھنے اور سمجھانے کا ہوسکتا ہے۔قرآن مجید نے بھی اس طریقہ کی حمایت کی ہے لیکن استدلال کے لئے بھی پھر راستے جدا جدا ہوجاتے ہیں اس کے لئے قرآن نے دو راستے اہل عالم کو دکھلائے ہیں۔ آفاق اور انفس۔ارشاد ہوتا ہے۔

"سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ ؕ اَوَ لَمۡ یَکۡفِ بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ"۔

ترجمہ :۔"ہم عنقریب انہیں اپنی نشانیاں آفاق عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ یقینا وہی (اللہ) حق ہے، کیا آپ کے رب کا یہ وصف کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز پر خوب شاہد ہے؟" (سورہ فصلت:53)

معلوم ہوا کہ ایک طرف ہیں تمام آفاق یعنی زمین و آسمان کی درمیانی کائنات اور دوسری طرف خود نفس انسانی۔ اور وہ نقطہ دان رموز معرفت جو امت اسلامیہ میں مدرسہ ا آ لہیات کا سب سے بڑا معلم تھا یعنی امیر المومنین حضرت امام علی علیہ السلام انہوں نے دوسرے شعبہ کو بڑی اہمیت دی اور فرمایا "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ "۔

"جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خدا کو پہچان لیا"۔

یہ عجیب چیز ہے۔ خود شناسی ذریعہ بن رہی ہے خدا شناسی کا اب اس کی صورتیں مختلف ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے نفس کے نقائص کو جس نے سمجھ لیا ۔ وہ خدا کے کمال کا پتہ لگا لے گا۔ دوسرے یہ کہ اپنے نفس کے خصوصیات و کمالات کو جو سمجھے گا وہ خدا کے کمال کا ادراک کرسکے گا۔ یہ وہ چیز ہے جسے میں نے آپ کے سامنے اس عنوان سے پیش کیا تھا کہ کائنات میں عقل و شعور کا وجود خالق کی حیات و قدرت کا پتہ دیتا ہے۔اس تمام دنیا میں انسان ہی ہے جس میں سب سے زیادہ کمالات مجتمع ہیں ۔ اس میں وہ جسمانیت بھی ہے جو پتھروں میں موجود ہے۔وہ نشوونما بھی ہے جو نباتات میں ہے۔ وہ حس و حرکت بھی ہے جو حیوانات میں پائی جاتی ہے اور سب سے آخر میں غیر محسوس چیزوں

کا ادراک بھی انسان کے دماغ میں مضمر ہے۔اب اگر خدا کی معرفت حاصل کرنا ہو تو قریب ترین ذریعہ اس کا یہ ہے کہ وہ اسی انسان کی ہستی پر غور کرے کیونکہ عقل و شعور اور صفت ادراک کا مظہر ہے ۔ اور جب اسے آئینہ قرار دیا جائے گا خالق کی معرفت کا تو یہ سمجھ میں آئے گا کہ اس کا خالق یقیناً عقل و شعور کا مالک ہے اور ایک قادر و مختیار ہستی ہے ۔

آپ غور فرمایئے تو معلوم ہوگا کہ خودشناسی کا ذریعہ اگر نہ ہوتا تو خدا کی معرفت اتنی ہمہ گیر نہ ہوسکتی تھی جتنی اب ہوسکتی ہے ۔بات یہ ہے کہ دنیا کی جتنی چیزیں ہیں ان سب کا ادراک انسان کو کچھ آلات و اسباب کے ذریعہ سے ہوتا ہے یعنی کچھ چیزیں دیکھنے کی ہیں ، کچھ سننے کی ۔ کچھ چکھنے کی ۔ کچھ سونگھنے کی اور کچھ چھونے کی ۔موجودات عالم میں نمایاں سے نمایاں چیز آفتاب ہے مگر اس کا جرم نورانی قوت باصرہ کا طالب ہے ۔

اگر آنکھ احساس نہ کرے تو اس کا ادراک نہیں ہوگا اس کی تیز شعاعوں کی حرارت قوت باصرہ سے متعلق ہے ۔ یہ قوت اگر نہ موجود ہو تو ،اس کا ادراک غیر ممکن ہے ۔یوں سے خدا کی تمام بڑی اور چھوٹی مخلوق ۔ خواہ پہاڑ ہوں ۔ خواہ دریا ۔ خواہ درخت ہوں اور خواہ آسمان اور اس کے اجرام ۔ اب اگر خدا کی معرفت انہی کائنات عالم کے ساتھ وابستہ ہوتی تو ایسا شخص جس کے حواس ظاہری معطل ہیں ۔ قوت باصرہ مقصود ہے ۔

سامعہ بیکار ہے اور قوت ذائقہ یوں ہی دوسری طاقتیں مصروف عمل نہیں ہیں ۔ ایسا شخص خدا کے وجود کا پتہ نہیں لگا سکتا ۔فرض کیجئے ایک انسان قید خانہ میں پیدا ہوا اور کال کوٹھری میں آنکھ کھولی

جہاں نہ آسمان تھا نہ زمین دکھلائی دیتی تھی ۔ نہ گرجتے ہوئے بادل نہ برستا ہوا پانی نہ بہتے ہوئے دریا اور نہ مسکراتے ہوئے پھول اور نہ لہلہاتا ہوا سبزہ ۔ خدا کی اس حیرت انگیز مخلوق میں سے اس نے کسی چیز کا بھی مشاہدہ نہیں کیا ۔ وہ تمام چیزیں جو آفاق میں دلیل قرار پاسکتی ہیں کبھی اس کو نظر ہی نہیں آئیں ۔اب کیا کہیے گا اس شخص پر حجت خدا تمام نہیں ہوئی ۔ کیونکہ خدا کا وجود تو انھیں نشانیوں سے سمجھ میں آتا ہے ان ہی کو اس آیت میں پیش کیا گیا ہے ۔

"اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ الۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا وَ بَثَّ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ ۪ وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ"۔

"یقینا آسمانوں اور زمین کی خلقت میں، رات اور دن کے آنے جانے میں، ان کشتیوں میں جو انسانوں کے لیے مفید چیزیں لے کر سمندروں میں چلتی ہیں اور اس پانی میں جسے اللہ نے آسمانوں سے برسایا، پھر اس پانی سے زمین کو مردہ ہونے کے بعد(دوبارہ) زندگی بخشی اور اس میں ہر قسم کے جانداروں کو پھیلایا، اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں عقل سے کام لینے والوں کے لیے نشانیاں ہیں"۔ (سورہ البقرۃ:164)

اگر خدا کی نشانیاں منحصر ہوتیں ان ہی چیزوں میں تو وہ پا بند زنداں انسان جس نے آنکھیں کھولیں قید خانہ ہی میں بےشک خدا کے پہچاننے سے معزور ہوتا مگر خدا نے ایک نشانی ایسی قرار دی ہے جو تمام مادی ذرائع سے بے نیاز ہے ۔وہ خود انسان کا نفس ہے ۔ یہ ہر گز حواس ظاہریہ کا محتاج نہیں ہے آپ کو اپنا احساس ہے کہ میں ہوں ۔

کیا آپ چھو کر دیکھتے ہیں کہ میں ہوں ؟ یوں سمجھتے ہیں کہ میں ہی ہوں ۔ چکھتے ہیں اپنے تئیں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں ہی ہوں اپنی آواز سنتے ہیں تب معلوم ہوتا ہے کہ میں ہوں۔اپنی خوشبو سونگھتے ہیں اسے معلوم ہوتا ہے؟ کچھ بھی نہیں ۔ بلکہ اگر کسی انسان کے تمام حواس معطل ہوں تو خود اپنا ہونا ہی اپنی تئیں بتلاتا ہے کہ میں ہوں ۔ دنیا کی تمام چیزوں کا ادراک صورت کا محتاج ہے کہ وہ صورتیں ذہن میں آئیں تب ان کا ادراک ہو ۔

مگر یہ اپنا ہی وجود ہے جو بغیر صورتوں کے واسطہ کے اپنے تئیں بتلاتا ہے۔اور جب یہ انسان کی ہستی خود خدا کے وجود کی دلیل ہے تو اب خدا کی معرفت بھی حواس کی پابند نہیں رہی اور نہ مادی ذرائع کی محتاج تمام حواس معطل ہوں مگر ادھر انسان کو خود اپنے وجود کا احساس پیدا ہوا بس اسی کے ساتھ خالق کے وجود کی دلیل بھی قائم ہو گئی اور اس کو ماننے کا راستہ مل گیا ۔یہ انسان کا نفس اگر انسان نے اس کو سمجھ لیا تو خدا کو سمجھ لیا ۔ بات یہ ہے کہ یہ انسان جب اپنی حاجتوں پر اپنے ضروریات پر نظر ڈالے گا تو اسے اپنے مافوق کسی خالق کسی فیض رساں ہستی کی تلاش پیدا ہو گی ۔

اب اگر اس فیض رساں ہستی کو اس نے ڈھونڈھنا چاہا تو وہ دنیا کا جائزہ لے گا لیکن ہر چیز کو اپنے سے پست پائے گا کیونکہ وہ اس کائنات میں سب سے اشرف ہے ۔ اس نے اگر دنیا کی کسی چیز کے سامنے سر جھکا دیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے تئیں پہچانا نہیں ہے ۔میں سچ کہتا ہوں کہ بت پرست بتوں کے سامنے جھک گئے اس لیے کہ اپنے تئیں پہچانا نہ تھا ۔ ستارہ پرست ستاروں کے لیے سر بسجود ہو گئے ۔ اس لیے کہ اپنے تئیں نہیں پہچانا نہ تھا ۔ آفتاب پرست آفتاب کے سامنے سرنگوں ہوئے ۔ صرف اس وجہ سے کہ اپنے تئیں پہچان نہ سکے تھے ۔ لیکن اگر اپنے تئیں پہچان

لیتے کہ ہم کون ہیں تو کبھی اپنے سے پست چیزوں کے سامنے سر خم نہ کرتے ۔ یہ انسان اگر اپنے تئیں پہچان لے تو اسے معلوم ہو گا کہ کائنات کی کوئی شئے میرے مقابلے پر نہیں ہے۔ اسے دنیا اپنے سامنے ہیچ نظر آئے گی اور اس لئے وہ عالم امکان میں کسی شے کو اپنا معبود ماننے پر تیار نہ ہو گا ۔اب چونکہ وہ یہ طے کر چکا تھا کہ میری بھی فیض رساں ہستی کوئی ضرور ہے ۔ اس لیے اس کی نگاہ عالم امکان سے بالاتر متوجہ ہوگی اور وہ ان تمام نقائص سے الگ ہو کر جو امکان و حدوث کا لازمہ ہیں کمال و دجوب کی طرف رخ کرے گا اور وہ اس طرح خودشناسی پورے طور پر خدا شناسی کا ذریعہ قرار پائے گی ۔

☆☆☆☆☆

خدا کے وجود پر آئمہ معصومین کے بیانات

خداوند عالم کے وجود کے لئے آئمہ معصومین نے ہر انسان کے معیار عقل و دماغ کے مطابق دلائل پیش کئے گئے ہیں ۔ کبھی سطحی ذہن رکھنے والے سادہ طبیعت اشخاص کے لئے اور کبھی باریک نگاہ اور تکنہ رس فلاسفہ کے لئے اور یہ حقیقت ہے ہی ایسی جیسے ایک بلند نگاہ فلسفی انتہائی دقیق اور غامض دلائل سے ثابت کرتا ہے تو ایک معمولی انسان اپنے فہم کے مطابق بالکل سادہ الفاظ میں وہی امکان و حدوث اور معلول و علت کا استدلال جو فلسفی اصطلاحات کے جال میں پھنس کر ہفتحواں بن جاتا ہے اسی کو ایک ضعیف العمر بڑھیا بالکل آسان طریقہ سے کہہ دیتی ہے اس وقت جب اس کے سامنے چرخا ہے اور وہ کات رہی ہے ۔کوئی پوچھتا ہے کیا خدا ہے؟ وہ کہتی ہے ضرور پوچھتا ہے کیونکر ؟ کہتی

ہے۔ دیکھو ! یہ چرخا جب تک میں اسے چلاتی رہتی ہوں ۔چلتا رہتا ہے اور ادھر میں نے ہاتھ روکا بس یہ چرخا رک گیا۔ پھر جب یہ اتنا سا چرخا بغیر میرے چلائے نہیں چلتا تو اتنا بڑا دنیا کا انتظام بغیر کسی منتظم کے کیسے قائم رہ سکتا ہے۔

یہ حقیقتاً وہی فلسفی استدلال ہے جو اتنے آسان طریقہ سے سادی صورت پر بیان کردیا گیا ہے۔ اسی طرح آئمہ معصومین علیہم السلام انھوں نے ایک ہی بات کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے ۔ اور یہی مفید طریقہ ہدایت کا ہوسکتا ہے ۔ مطلب ایک تھا ۔ لفظیں بدلی ہوئی تھی ۔ منزل ایک ، راستے جدا جدا ۔

کبھی ایک فلسفی کے انداز پر ابو شاکر دیعانی سے ارشاد فرمایا جب اس نے پوچھا

"مَا الْدَلِيلُ عَلَى أَنَّ لَكَ خَالِقًا"۔

"کیا دلیل ہے اس بات کی کہ آپ کا کوئی خالق ہے؟" اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔

"وَجَدْتُ نَفْسِي لَا تَخْلُو مِنْ أَيِ جِهَةٍ، إِمَا أَن أَكُونَ صَنَعْتَهَا وَكَانَت مَوْجُودَةً أَو صَنَعْتَهَا وَكَانَت مَعْدُومَةً .فَإِن كُنْتُ صَنَعْتَهَا وَكَانَت مَوْجُودَةً فَقَدِ اسْتَغْنَيْتُ بِوُجُودِهَا عَن صَنْعَتِهَا، وَإِن كَانَت مَعْدُومَةً فَإِنَكَ تَعْلَمُ أَن الْمَعْدُومَ لَا يُحْدِثُ شَيْئًا .فَقَد ثَبَتَ الْمَغْنِي الْثَالِثُ أَن لَآخَرَ إِلَا هُوَ اللّٰهُ رَب الْعَالَمِين"۔

"میرا نفس جبکہ وہ اپنے وجود کا خود باعث ہوتو دو صورتوں سے خالی نہیں یا تو وہ اپنے وجود کا باعث ہو جبکہ وہ موجود تھا یا وہ اس کے وجود کا باعث ہو جبکہ وہ معدوم تھا اگر وہ اپنے وجود کا باعث ہو جبکہ موجود تھا تو پھر اس کو دوبارہ وہ وجود بخشنے کی ضرورت کیا تھی اور اگر وہ اس کے وجود کا باعث ہوا جب وہ معدوم تھا تو وہ وجود عطا کرنے کا باعث کیونکر ہوسکتا ہے کیونکہ معدوم کسی شئے کو موجود نہیں

بنا سکتا لہٰذا تیسری صورت ثابت ہوگئی کہ اپنے وجود کا باعث یہ خود نہیں ہے بلکہ کوئی اور اس کا خالق ہے اور وہ اللہ ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے"۔

کبھی بالکل سادہ الفاظ میں عربوں کے ماحول پر نظر کرتے ہوئے مخاطب کو اس طرح سمجھایا گیا کہ۔

"الْبَعْرَةُ تَدُلُ عَلَى الْبَعِيرِ وَالرَوْثَةُ تَدُلُ عَلَى الْحِمَارِ وَآثَارِ الْقَدِ تَدُلُ عَلَى الْمَسِيرِ فَهَذَا الْهَيْكَلُ الْعُلْوِيُ بِهَذِهِ اللَطَافَةُ وَهَذَا الْمَرْكَزُ السَهلُ عَلَى بَهَدِ الْكَثَاثَةِ كَيْفَ لَا يَدُلُ عَلَى اللطيف الْخَبِير"۔

"یعنی تمھیں راستہ میں اگر اونٹ میگناں نظر آئیں تو تم سمجھو گے کہ کوئی اونٹ ادھر سے گزرا ہے اور اگر گدھا گزرا ہوتو اس کا پتہ چلے گا اور پیروں کا نشان کسی راہوار کا پتہ دینگے پھر یہ بڑا آسمان اس لطافت کے ساتھ اور یہ زمین اس کثافت کے ساتھ کیونکر خدا نے باریک بین و باخبر کے وجود کی دلیل نہ ہونگے"۔

اس میں ایک دیہاتی اور جنگلی انسان کے سامنے آنیوالی چیزوں کو پیش کرکے یہ سمجھایا گیا ہے کہ ہر اثر کا ایک مؤثر ہوتا ہے اور ہر شئے اپنے سبب کا پتہ دیتی ہے۔ کبھی نفسیات کے ذریعہ سے ثابت کیا۔ جب ایک شخص نے پوچھا کہ آپ نے اپنے خدا کو کیونکر پہچانا فرمایا۔

"عَرَفْتُ رَبِيَ بِشِكَسْتِ الْحِزَمِ وَإِنْهِزَامِ الْحُمَمِ .كُلَمَا عَزَمْتُ فَكَسَرَ عَزِيمَتِي وَكُلَمَا هَمَمْتُ فَقَطَعَ هِمَتِي".

ترجمہ: "میں نے اپنے خدا کو پہچانا مضبوط ارادوں کے ٹوٹ جانے سے اور ہمتوں کے پست ہو جانے سے جب میں کوئی ارادہ کرتا ہوں وہ میرے ارادہ کو شکست دے دیتا ہے اور جب ہمت باندھتا ہوں وہ ہمت کو روک دیتا ہے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بالادست طاقت ہے جو ہمارے ارادوں کے مافوق ہے۔ اور کبھی وجدانیات کے ذریعہ سے سمجھایا جس وقت کہ ایک دہریہ سے گفتگو بہت طوالانی ہوئی۔ امام نے فرمایا کبھی ایسا اتفاق ہوا ہے کہ تو کشتی پر سوار ہو اور طوفان آیا۔ کشتی بالکل منجدھار میں تھی اور کوئی ساحل قریب نہ تھا اور نہ کوئی درخت نظر آتا تھا۔ نہ کوئی شخص تھا جو تجھ کو بچائے۔ اس نے اقرار کیا کہ ہاں ایسا واقعہ پیش آیا ہے حضرت نے فرمایا سچ بتانا کہ کیا اس وقت بھی دل میں یہ خیال آیا تھا کہ کوئی اس وقت بھی مجھے بچا سکتا ہے؟ اس نے کہا بےشک کچھ تو ڈھارس تھی۔ فرمایا بس ایسے وقت میں جس سے امید وابستہ ہوتی ہے وہی خدا ہے۔

☆☆☆☆☆

منکرین خدا کا سرمایہ

جن جماعتوں نے خدا کے وجود کا انکار کیا ہے اگر ان کے دلائل کی تحلیل کی جائے اور ان کے بیانات کو دیکھا جائے تو سب کا ماحصل عدم علم قرار پاتا ہے ۔ یہ کوئی دعویٰ کرے کہ کائنات خودبخود پیدا ہوئی ہے اور اس کا ثبوت پیش کرے ۔ ایسا نہیں ہے ۔ منکرین کا تمام سرمایہ صرف شک و شبہ ہے وہ کہتے ہیں کہ ہماری عقل اس کے وجود کو نہیں بتلاتی اور پتہ نہیں دیتی ۔ ظاہر ہے کہ عدم علم کبھی مقابلہ نہیں کر سکے گا ان دلائل کا جو ثبوت میں قائم ہوں ۔ جب تک وہ دلائل غلط نہ ثابت کر دیئے جائیں ۔فرض کیجئے کہ مادین مشاہدہ کے ذریعہ سے مادہ کے اجزاء اور ان کے حرکات ہم کو اپنی آنکھوں سے دکھلا دیں حالانکہ ایسا نہیں ہے مادہ خود ان دیکھی چیز ہے جس پر خواہ مخواہ ایمان لے آیا

گیا ہے ۔اس کی تفصیل بعد میں آئے گی پھر بھی تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس مادہ سے مافوق کوئی باختیار طاقت نہیں ہے ۔

یہ مادہ کے اجزاء بہرحال وہ اجزاء ہو سکتے ہیں کہ جن سے کائنات عالم وجود میں آتی ہے۔یہ وہ مشین کے پرزے ہیں جو متحرک ہیں لیکن اس کے حرکات سے جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں وہ کسی عقل و حکمت کے ماتحت ہیں یا نہیں اس کا اندازہ ان کے نظم و ترتیب سے ہو سکتا ہے ۔جبکہ دنیا کا نظم و ترتیب ہم کو ایک حکمت و دانش کا پتہ دے رہا ہے تو ہم اس کے لیے ایک فاعل مختیار ماننے پر مجبور ہیں اس سے ہمارے اور مادین کے درمیان جو چیز خط فاصل بنتی ہے اور جہاں آ کے بحث رکتی ہے وہ مادہ کا ثبوت اور اس کا ابطال نہیں ہے۔

بلکہ اس مادہ کا خلقت کائنات کے لیے کافی ہونا اور نہ ہونا یعنی وہ مادہ اور اس کے حرکات کو کافی قرار دے کر خالق سے بے نیاز بننا چاہتے ہیں اور ہم مادہ اور اس کے تغیرات کے ہوتے ہوئے بھی ایک خالق کے وجود کو ضروری سمجھتے ہیں جو اپنی حکمت اور مصلحت کے ساتھ مادی اشیاء کو عالم وجود میں لائے ۔

☆☆☆☆☆

مادیین کا مذہب اور اس پر تبصرہ

مادیین کا خیال ہے کہ دو چیزیں ہیں۔مادہ اور قوت ان ہی دو چیزوں کی بدولت تمام کائنات عالم وجود میں آتی ہے۔ مادہ کیا ہے ؟اس کی حقیقت میں بہت بڑا اختلاف ہے اور اس کا سمجھنا بہت مشکل قرار دیا گیا ہے۔ بہر حال مادہ کے

متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عالم میں اس طرح پھیلا ہوا ہے کہ ازل سے لیکر اس وقت تک نہ اس میں ایک رتی بھر اضافہ ہو سکا ہے اور نہ رتی بھر اس میں کمی ہوئی ہے۔

بالکل ایک مقدار پر اور ایک درجہ پر وہ رہا ہے۔ جتنی چیزوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں انقلاب پیدا ہوتا ہے وہ فنا کبھی نہیں ہوتیں بلکہ صورت میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ آگ پر پانی کو رکھا۔ آگ نے جلا دیا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ وہ فنا ہو گیا۔ مگر فنا نہیں ہوا۔ جس وقت اس میں حرارت پہنچی تو وہ اڑ گیا بھاپ بن کر۔ پانی نہیں رہا صورت جاتی رہی۔

لیکن وہ اجزاء بہر حال کسی نہ کسی صورت میں قائم ہیں۔ اسی طرح آپ نے زمین میں بیج بویا۔ اب وہ پتی کی شکل میں نمودار ہوا تو کیا کوئی نئی چیز عالم وجود میں آئی؟ نہیں! بلکہ وہ زمین کے اجزاء تھے۔ جن میں قوت نامیہ نے سرایت کی اور وہ درخت کی شکل میں آگئے۔ کوئی نیا مادہ نہیں پیدا ہوا۔ مادہ ناقابل زوال ہے۔ ازلی ہے اور اس کو کسی خالق کی ضرورت نہیں۔

ایک زمانہ میں فلاسفہ کا مسلک یہ تھا کہ سب سے پہلے پانی ہے اور اصل مبداء تمام چیزوں کا وہی پانی ہے اور وہ عنصر و عنصر ہے تمام اشیاء کا۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ پانی بھی مرکب ہے۔ قدیم فلاسفہ نے چار عناصر قرار دئے تھے۔ آگ۔ پانی۔ خاک۔ ہوا۔ اب جہاں تک تحقیق ہوئی ہے اس سے معلوم ہوا ہے کہ سو کے قریب عناصر مفرد و مرکب ہیں۔ دنیا کی چیزوں میں بعض مرکب ہیں اور بعض مفرد ہیں بعض اشیاء ان میں سے دو دو سے مل کر تیار ہوتے ہیں جیسے پانی جو دو سے مرکب ہے۔ بعض میں تین چار۔ اور بعض میں اس سے بھی زیادہ چیزیں شریک ہو گئ ہیں۔ جب ان عناصر کی تحلیل کی گئ تو معلوم ہوا کہ اصل ان سب کے کچھ مفرد اجزاء ہیں نہایت چھوٹے، باریک ان کو سالمات اور جواہر فردہ کہا جاتا ہے۔

یہ نام ہے ان چھوٹے سے چھوٹے اجزاء کا جو کسی تدبیر سے قابل انقسام نہیں ہیں۔ یعنی ان کے ٹکڑے نہیں کئے جاسکتے اور کسی طرح کی تقسیم نہیں ہو سکتی کیونکہ تقسیم خارجی کے دو طریقے ہیں ایک کاٹنا دوسرے توڑنا۔ توڑنے اور کاٹنے میں یہ فرق ہے کہ وہ آلہ جس کے ذریعہ سے ایک شئے کو دو میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ اگر نفوذ کرے اندر تو کاٹنا ہے اور اگر نفوذ نہ کرے تو توڑنا ہے۔ آپ نے قینچی لی اور کاغذ کو کاٹ دیا۔ تو کاغذ کے اندر یہ قینچی عبور کرتی ہے۔ اس کو کہتے ہیں کاٹنا۔ اور آپ نے ہتھوڑا لیکر کسی شیشے کو دو ٹکڑے کر دیا۔ یہ ہے توڑنا۔

اگر کوئی چیز اتنی چھوٹی ہو کہ گنجائش آلہ کی نفوذ کی نہ ہو تو کاٹنے کے قابل نہ ہو گی۔ اور اگر اتنی سخت ہو کہ چوٹ کا اس پر اثر نہ ہو تو توڑنے کے قابل نہ ہو گی۔ وہ سالمات کہ جن سے مادہ کی ترکیب بنائی گئی ہے۔ ایسے ہی ہیں کہ وہ چھوٹے اور سخت ہونے کی بناء پر نہ ٹوٹ سکتے ہیں اور نہ کٹ سکتے ہیں۔ اس تمام عالم عناصر میں جتنا بھی مادہ ہے۔ سب کے انتہائی مرکز یہ سالمات ہیں۔ سابق زمانہ کے لوگ اس بات کے قائل تھے کہ یہ سالمات خلا میں رہتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ تحقیق ہوا کہ خلا کا وجود عالم طبیعی میں محال ہے اس لئے ضرورت ہے ایسے مادہ کے فرض کرنے کی جس میں یہ سالمات قائم رہیں۔ اس کا نام رکھا گیا ایتھر۔ اس میں یہ سالمات اس طرح پیرنے ہیں کہ جس طرح سیارے فلک کی فضائی آسمان میں متحرک ہیں۔

جس طرح ان کی حرکت کا منشا آج تک نہیں معلوم ہو سکا۔ اسی طرح سے ان سالمات کی حرکت کا منشا نہیں ثابت ہو سکا۔ ایتھر کیا ہے؟ آپ اس کو نہایت شفاف، صاف، لطیف اور خالص ہوا سمجھ لیجئے۔ اس کو عربی میں اثیر کہا جاتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کے اندر یہ تمام اجزاء ومادی متحرک ہیں۔ اچھا یہ تو تھا مادہ۔ قوت کس کا نام ہے؟ یہ قوت نام ہے اس حرکت کا جو ان مادہ کے اجزا میں پائی جاتی ہے۔ حرکت کی دوسری تعبیر حرارت سے کی جاتی ہے۔ کیونکہ حرارت و حرکت لازم وملزوم ہیں۔ آپ جب چلتے ہیں تو پسینہ نکلتا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ حرکت و حرارت۔ سابق

زمانہ میں جب آگ پیدا کی گئی۔ وہ اسی طرح پیدا ہوئی کہ اجسام کا تصادم ہوا۔ اور اس حرکت سے جو حرارت پیدا ہوئی اس سے آگ ظاہر ہوئی۔ یہ حقماق پتھر پر مارا جاتا تھا تو آگ پیدا ہوتی تھی۔ اب بھی دیکھ لیجیے کہ دیا سلائی آپ گھر میں رکھے رہیئے۔ لیکن وہ جلے گی نہیں جب تک ڈبیا پر رگڑی نہ جائے۔ یہ حرکت ان اجزا میں دو چیزوں کے ماتحت ہوتی ہے۔ ایک جزب اور دوسرے دفع۔ جزب یعنی دوسرے جسم کو اپنی طرف کھینچنا۔ دفع یعنی دوسرے جسم کو اپنے سے دور کرنا۔

یہ لکڑی جو ہے اس کو آپ کاٹنا چاہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوت سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ یہ قوت جزب کا نتیجہ ہے۔ جو اس کے اجزا میں پائی جاتی ہے۔ جتنی قوت جزب زیادہ ہو گی اتنا ہی جدا کرنا دشوار ہو گا۔ لوہے کے اجزا میں سب سے زیادہ جزب ہے۔ لکڑی میں اس سے کم ہے۔ اور جو معمولی چیزیں ہیں جو جلدی سے کٹ جاتی ہیں ان میں یہ قوت جزب بہت کم ہے۔ اسی کے ساتھ ہے قوت دفع۔ لکڑی کو آپ ہاتھ سے دبانا چاہتے ہیں تو اس دبانے میں جس طاقت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے وہ قوت دفع ہے یعنی اس کے اجزا اپنے مخالف کو دفع کرتے ہیں۔ جتنی زیادہ یہ قوت ہو گی۔ اتنی ہی صلاحیت اور سختی پیدا ہو گی۔ روٹی میں قوت دفع کمزور ہے اس لیے وہ پھولی ہوئی ہے آپ کے سامنے نظر آئے گی۔ جتنا دباتے جائیں دبے گی۔

لیکن ایک حد تک پہنچ کر پھر آپ کے دباؤ کو قبول نہ کریگی اس کا نام ہے قوت دفع۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مادہ کے اجزا میں قوت جزب و قوت دفع کی بنا پر حرکت اور اس کے ساتھ اجتماع و افتراق پیدا ہوتا ہے۔ مادہ میں چار طرح کی چیزیں ہیں۔ حرکت – سکون – اجتماع – افتراق اسی سے مختلف اقسام کی تشکیل ہوتی ہے۔ آپ ایک عمارت کو دیکھتے ہیں جو کئی منزلوں کی ہو۔ یہاں قوت جزب مصروف و عمل ہو رہی ہے ایک پر دوسرا درجہ بنایا دوسرے پر تیسرا درجہ بنایا۔ یہ انسان کے ارادہ و اختیار سے تھا۔ لیکن اگر پانی ہو۔ جس میں نمک ملا ہوا ہو۔ پانی میں نمک گھول دیجیۓ

اور خوب اس کو ملا دیجیئے۔اس کے بعد اس کو رکھ دیجیئے ۔ وہ نمک کے ذرے بیٹھنا شروع ہونگے ۔ ایک مستقل صورت پر اور ایک مستقل ترکیب پر اس کی سطحیں قائم ہونگی یہ نہ ہوگا کہ کہیں بلند ہو جائے۔ کہیں پست ہو جائے بلکہ بالکل متوازن صورت پر وہ ذرے بیٹھتے جائیں گے۔

یہاں تک کہ ایک سطح برابر نمک کے ذروں کی بن جائے۔اگر آپ اس کو کسی خوردبین سے دیکھے تو جس طرح حسین آباد کے سنگھنڈے میں ایک طبق دوسرے پر ہے۔اور جسے ورق ہوں اور وہ ایک دوسرے پر بچھائے گئے ہیں اسی طرح یہ نمک کی تہیں ہیں۔یہ طبق کسی انسانی ہاتھ نے نہیں قائم کیے ہیں۔بلکہ وہی قوت جزب ہے جس کے نتیجے میں یہ اجزا ایک دوسرے کی طرف کھینچ رہے ہیں۔کیونکہ جو سب سے پہلے سطح تھی اس کے ہر ہر جزو میں قوت جزب موجود تھی۔یہ نہیں کے بعض میں ہیں اور بعض میں نہیں ہے۔ہر جزو کھینچ رہا تھا اور ایک کے بعد دوسرا اجزو آتا تھا اس لیے سب کی ایک مساوی سطح قائم ہو جاتی ہے۔اور بعض مقامات پر تو یہ سطح بالکل خوبصورت سڈول ہوتی ہے۔خصوصاً برف کی چٹانوں کی۔

جہاں برف گرتی ہے وہاں کے لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ برف پہاڑوں پر ایسی چکنی خوبصورت چمکنا۔چوٹیاں تیار کر دیتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے تراش کر انہیں بنایا ہے۔لیکن کسی نے ان کو تراشا نہیں ہے۔بلکہ برف جو گرتی ہے وہ خاص ترتیب سے آکر قائم ہو جاتی ہے۔یہ نتیجہ اسی قوت جزب کا ہے اور یہیں قوت دفع بھی مصروف عمل رہتی ہے۔جو چیز کہ اس کی ذاتی خصوصیتوں کے مخالف ہو۔

اس کو وہ دفع کرتی ہے یہاں تک کہ خود آپ لوگوں میں۔آپ کے خصوصیات طبعی موت یہ جذب و دفع کی طاقتوں کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔مثلاً دو شخص آپ کے سامنے آتے ہیں۔آپ نے ان کو کبھی دیکھا نہیں لیکن خواہ مخواہ ایک کی

طرف میلان طبع پیدا ہوتا ہے۔ اور دوسرے سے پہلی ہی نظر میں طبیعت متنفر ہو جاتی ہے۔ جس کے ساتھ ملتے جلتے ہوتے ہیں اس سے میلان ہوتا ہے۔ جس سے اختلاف رکھتے ہیں اس سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ آپ سیلاب کی زد میں پانی کی رفتار کو دیکھئے خصوصاً ایک دہانہ جہاں پر پانی گھٹ کر پھر باہر نکلتا ہے۔ وہاں اس کی طاقت کو دیکھئے اور ملاحظہ کیجئے کہ وہاں وہ ایک اجتماعی شکل کے ساتھ بر آمد ہوتا ہے۔ یہ سب کیا ہے ؟

یہ قوت جزب ہے جو ایک دوسرے کو باوجود اتنے اضطراب و تلاطم کے ملائے رکھتی ہے۔ اس جزب و دفع کی طاقت نے مادہ کے اجزاء کو ملایا ہے اور متصادم کیا ہے۔ اور ان کے اجتماع ہی سے مختلف خواص اور خاص صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ عجب چیز ہے ان مفردات عالم ترکیبی میں کہ ہر ہر مفرد میں جو خاصہ نہیں ہے۔ ترکیب سے وہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ مثلاً اور ان میں اشتعال نہیں ہے۔

لیکن انھیں ملا دیا جائے تو اشتعال پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ان دونوں کے اجتماع کا نتیجہ ہے۔ دو پتھروں کو آپ نے رگڑا۔ اس سے آگ نکلی یہ صورت ہے ان چیزوں کی جن کو آپ زندگی اور حیات کا حامل کہتے ہیں۔ اسی طرح سے انسان جس وقت کسی چیز کا تصور کرتا ہے تو اس چیز کی طرف اس کا ذہن متوجہ ہوتا ہے۔ تو اس کے دماغ میں ایک ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے ایک شعلہ جو اٹھتا ہے۔ اس کا نام ہے ادراک۔ درحقیقت یہ سب اسی مادہ کی کارستانیاں ہیں اور یہ مادہ کے اجزاء ہیں جو آپس میں متصادم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ نہ کسی خالق کی ضرورت ہے نہ کسی موجد کی حاجت۔

یہ تھا مادیین کا نقطہ نظر جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا۔ لیکن ان مادیین سے جب ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ مادہ کے سالمات کو تم نے دیکھا ہے۔ تو صبر وسکون کے ساتھ اس بات کا اعتراف کر لیا جاتا ہے کہ کوئی دوربین کوئی

خورد بین دنیا کی ایسی نہیں ہے جو ان سالمات کے احساس میں ہمارے لئے کار آمد ثابت ہو۔ جتنی ذرہ بینیں اب تک ایجاد ہو چکی ہیں۔ ایک ایک چیز کو ہزار ہزار گنا دکھانے والی۔ ان سے ہم ایسے اجسام ہی کو دریافت کر سکتے ہیں جو قابل انقسام ہیں۔

لیکن ایسے اجزاء جو قابل انقسام نہیں ہیں ہم کو دکھلائی نہیں دیتے۔ پھر اب جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ مادہ کے ان سالمات کا ناقابل فنا ہونا بھی غلط ہے بلکہ وہ تصادم کے ذریعہ سے فنا ہو جاتے ہیں اور برقی لہروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان سالمات کا ناقابل تقسیم ہونا بھی غلط ثابت ہوا ہے۔ بلکہ جدید زمانہ کی تحقیق میں ان کو دو جزوں سے مرکب مانا گیا ہے۔ جن میں سے ایک کو مثبت اور ایک کو منفی کہا جاتا ہے۔ غور کیا جائے تو پورا دارومدار مادی مذہب کا حرکت پر ہے۔

لیکن یہ حرکت کیا ہے؟ وجود و عدم کا مجموعہ! حرکت غیر ثابت، بے قرار ایک سیال کیفیت رکھنے والی چیز ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا کوئی جزو آ نہیں سکتا۔ جب تک پہلا جزو رخصت نہ ہو جائے۔ جتنی چیزیں اس طرح کی ہیں۔ ان کا اجتماعی وجود ہمیشہ ایک موہوم حیثیت رکھتا ہے۔ کسی شئے کی حرکت کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ ایک محل پر اس شئے کا ہونا بعد اس کے کہ وہ اس میں نہ تھی کیونکہ پہلے وہ دوسرے محل پر تھی۔ اگر وہ پہلے بھی اسی محل پر تھی تو حرکت نہ ثابت ہو گی۔ حرکت کا مفہوم اسی وقت پیدا ہو گا جب اس کا عدم اس نقطہ پر مانا جائے اور پھر وجود کا تصور کیا جائے۔ اسی سے حرکت کے مفہوم کی تشکیل ہوتی ہے۔

جتنی چیزوں میں اس حرکت کا جزو شریک ہے۔ ان میں بے ثباتی موجود ہے۔ جیسے میرا کلام جب تک پہلی لفظ ذہن سے نکلنے کے بعد ختم نہ ہو جائے اس وقت تک دوسری لفظ آ نہیں سکتی بلکہ ایک ہی لفظ میں جب تک پہلا حرف جگر

خالی نہ کر دے اس وقت تک دوسرا حرف آ نہیں سکتا۔ ایک سیلابی عالم اور ایک رواں حالت ہے۔ معلوم ہوا کہ جب تک دنیا میں حرکت قائم ہے۔ اسے پابند وجود آپ مان نہیں سکتے بلکہ اس کے ہر وجود میں عدم کا پہلو شریک رہے گا۔ ہستی محض نہ ہوگی نیستی اس کے ساتھ پہلو نشین ہوگی۔

پھر اس کائنات کی کون سی چیز ایسی ہو سکے گی کہ اس میں وجود ہی وجود ہو اور عدم کی گنجائش نہ ہو۔ وہ جسے آپ مادہ کہتے ہیں ایک تڑپتی ہوئی ہستی رکھنے والی چیز اور ایک مضطرب وجود ہے۔ اس کی تو شان یہ ہے کہ بغیر کسی خاص صورت کہ اس کا وجود قائم ہی نہیں ہو سکتا۔یعنی غیر ممکن ہے کہ کوئی مادہ بغیر صورت کہ حاصل ہو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ محتاج ہے مادہ کا۔ حرکت وہ کوئی ایک چیز نہیں ہے جسے موجود کہا جاسکے یہ جائیکہ قدیم بلکہ اس کا ہر جزو ایک مستقل حادث ہے۔ اور وہ خود مجموعہ ہے ایک سلسلہ حوادث کا۔

ایک سلسلہ ہی وجود و عدم اور حدوث و فنا کا جو برابر چل رہا ہے اس کا نام ہے حرکت۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ ہر جزو کے ساتھ عدم کا پہلو شریک ہو بلکہ اس کے ہر جزو کی علت تیسنی ہے یعنی سابق جزو کا عدم باعث ہوتا ہے اپنے مابعد کے وجود کا کیونکہ جب تک یہ جزد معدوم نہ ہو دوسرا اجزو موجود نہ ہو سکے گا۔ اب یہ سلسلہ کتنا ہی ہو ذاتی سہی لیکن عقل تو بڑی وسیع چیز ہے وہی ان چیزوں کو جو حسدوو مشاہدہ سے بلند ہیں تصور کے ساتھ مجتمع کرکے اپنے سامنے لاتی ہے۔ اور ان پر حکم لگاتی ہے۔ یہاں پر بھی عقل اس پوری حرکت کو ایک مجموعہ کی صورت میں تصور کرتی ہے ۔

جب اس مجموعہ کی حقیقت پر غور کرتی ہے تو وہ حکم لگاتی ہے کہ جب تک اس کے ماقبل کا عدم فرض نہ کیا جائے اس وقت تک یہ مجموعہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا ۔کیونکہ مفہوم جس چیز کو تقضی ہو اسے

آپ ذات سے الگ کیسے کیجئے گا۔ ہم تو ڈھونڈ رہے تھےاس دنیائے کائنات میں ایسی چیز جو ذاتا وجود کی مقتضی ہو یہاں معاملہ برعکس نظر آتا ہے ۔ یعنی اس دنیائے کائنات کی ذات اپنے ماقبل عدم کی متقاضی ہے جب تک وہ نیستی فرض کی جائے ۔

اس وقت تک یہ سلسلہ شروع ہی نہیں ہوتا ۔آگے تو بعد کو بڑھے گا ۔ اب چونکہ وجود ہر شئے کا سبب کا طالب ہے اس لئے وجود کا سبب یا تو اس نیستی کو قرار دیجئے جو اس کے آگے ہے یا پھر کسی وجود کو مانئے جو اس نیستی کی شرکت سے الگ ہو ۔ یہ ظاہر ہے کہ نیستی شرط کسی شئے کے وجود کی ہوسکتی ہے لیکن مستقل سبب وجود کا ہرگز نہیں ہوسکتا ۔ نیستی تو نیستی ہی ہے جب تک کسی شئے میں خود وجود نہ ہو ۔وجود نحبش کیسے ہوسکتی ہے ۔اس لیے نیستی ہستی کی علت قرار نہیں پاسکتی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ایک ایسا وجود مانئے جو اس نیستی کی آمیزش سے باہر ہو۔

وہی اس حرکت کا پیدا کرنیوالا ہو اور وہی اس تمام نظام کا قائم کرنیوالا اسی کا نام واجب الوجود ہے۔پھر اس پر غور کیجئے کہ کسی شئے کی طبیعت کا تقاضہ بدل نہیں سکتا ۔ یعنی جو جس شے کسی طبعیت کا خاصہ ہے اس میں اختلاف نہیں پیدا ہو سکتا ۔ ایک طبیعت کی ماہیت اور حقیقت اور اس کا خاصہ ایک ہی ہو سکتا ہے ۔ تو ہم عالم ازل سے فرض کرتے ہیں کیا خاص نقطہ ۔ اگر مادہ کر اجزاء کچھ یہی سے موجود ہوئے ہوتے اور کچھ بعد تو میں کہتا کچھ مادہ کے اجزاء جن کو دس برس گزرے ۔

ان کی طبیعت کا خاصہ ایک ہے ۔ اور جن کو بیس برس گزرے ان کی طبیعت کا خاصہ اور ۔اس صورت میں اجزاء مادہ کی طبیعت اور خواص میں اختلاف ممکن تھا ۔ لیکن چونکہ یہ ہیں ازلی ہم اس

میں اجزاء اور زمانہ کی تفریق نہیں کر سکتے ۔ اب پہلے نقطہ پر اس کے اجزاء کا خاصہ کیا تھا ؟ یعنی ان حرکتوں کے ذریعہ سے کس طرح کی مخلوق ہونا چاہیے تھی ۔ یقیناً وہ ایک ہی شے ہو سکتی ہے تو پھر ہر ہر ذرہ میں یعنی عالم میں مشرق سے مغرب تک جتنے اجزاء ہیں ان کی طبیعت کا خاصہ ایک ہی ہونا چاہیے تھا ۔اور ایک ہی طرح کی مخلوق چاہیئے ۔

یہ زبردستی نہیں ہے عقل میں آنے کی بات ہو تو مانیے ۔مثلاً یہ پانی فرض کیجئے ۔ اس کی طبیعت کا تقاضہ ہے کہ دس منٹ تک آگ کے اوپر رکھا رہے تو گرم ہو جائے پھر دس منٹ رکھا رہے تو بالکل کھولنے لگے پھر دس منٹ جوش آجائے اور ابلنے لگے ۔اس میں پانی کے اجزاء کے اندر تفریق ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ اس کی طبیعت کا خاصہ ہے ۔ پھر اگر اس مادہ کے علاوہ کوئی اور چیز ہوتی جیسے آگ کے تو ممکن تھا کہ یہ آگ جن اجزاء سے قریب ہے ۔ان میں کچھ اثر پیدا ہو ۔ اور جن سے یہ دور ہے ان میں کچھ اثر پیدا ہو جیسے فرض کیجئے کھچڑی پکائی۔ چاول آدھے کچے رہ گئے ۔ بھانپ نہیں پہنچی۔لیکن یہاں تو یہ فرض کیا گیا ہے کہ شروع میں اس مادہ کے ذرات تھے ۔

ان میں قوت تھی اور اس کے آگے کچھ تھا ہی نہیں ۔ جب کچھ نہیں تھا ۔ اور مادہ تمام عالم میں پھیلا ہوا تھا تو جو اس کی طبیعت کا تقاضہ ہو اسے ہمہ گیر صورت پر پیدا ہونا چاہیے ۔مثلاً ابتدائی منزل میں مادہ کی طبیعت کا تقاضہ ہے جمادتو شروع میں پتھر ہی پتھر ہونا چاہئیں وہ بھی ایک خاص رنگ خاص خاصیت کے پھر جب ایک لاکھ برس مثلاً اور گذریں تو چونکہ بس وہی اجزاء ہیں اور ان میں طبعی تقاضے سے انقلاب ہو رہا ہے تو اب مثلاً سب پتھر فنا ہو کر درخت بن جائیں ۔تمام کائنات میں درخت ہی درخت نظر آنے لگیں ۔ جس وقت میں یہ دور بھی منقضی ہو اس وقت ابال اس مادہ کا

درجہ پر پہنچنے کہ حیوانات نمایاں شروع ہوں اور پھر ان کے بعد ایک وقت ایسا آئے کہ انسان ہی انسان دنیا میں ہو جائیں ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے ۔ مادہ وہی ہے ۔ اس کے ذرات وہی ہیں لیکن کائنات بلکل مختلف ظاہر ہو رہی ہے ۔ کہیں پتھر نمودار ہوتے ہیں کہیں درخت اور حیوان اور کہیں انسان۔

یہ تغیر آثار اور خواص پتہ دیتا ہے کہ یہ غیر اختیاری خاصہ طبیعت نہیں تھا جبکہ کسی کاتب کا بنایا ہوا نقش ہے ۔ جہاں جو نقطہ رکھ دیا وہی وہاں نظر آتا ہے ۔ ہم نے مانا کہ یہ مادہ اس کے لیے روشنی کا کام دیتا ہے ۔ مگر یہ صرف روشنی کا کام نہیں ہے کہ یہ مختلف نقوش تیار ہو جائیں ۔ بلکہ کسی کاتب کا قلم ساتھ چلتا ہے جو قدرت و اختیار کے ساتھ ہر جزو کو اس کے محل پر رکھتا ہے ۔آپ نے نمک کے ذرات کی مثال دے دی کہ وہ بیٹھتا ہے تو مستوی سطح کی صورت میں قائم ہو جاتا ہے ۔

کیونکہ قوت جزب مساوی طور پر کام کرتی ہے لیکن بغیر کسی خارجی سبب کے یہ غیر ممکن ہے کہ کسی ایک طرف زیادہ جمع ہوا اور کسی دوسری طرف کم یا ایک طرف وہ مدور شکل بنا دے اور دوسری طرف مثلث ۔کہیں بلند ہو جائے اور کہیں پست ۔ اس کے علاوہ خواہ یہ نمک ہو جو متساوی سطح کی صورت میں بیٹھتا ہے یا وہ فوارہ سے نکلتا ہوا پانی ہو۔بے شک کوئی نہ کوئی مقدار ہو گی ۔ کیونکہ مقدار تو ہر جسم میں ضروری ہے ۔ لیکن کیا وہ بیٹھنے والا نمک اس کا بھی زمہ دار ہو گا کہ آپ کو جس طرح کی صورت کی ضرورت ہو اس طرح سے بیٹھے ۔ ہندسی شکل کے مطابق تو ہو گا ۔ لیکن اغراض و فوائد کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔

آپ جس وقت جہاز پر سفر کریں تو ملاحظہ کر ینگے کہ جہاز کے چلنے کی وجہ سے سمندر میں تلاطم پیدا ہوتا ہے ۔دود دور تک معلوم ہوتا ہے کہ اٹھتی ہوئی موجیں آپس میں لڑتی ہوئی جاتی ہیں اور تھوڑی دور پر ایک ٹیلا بنا دیتی ہیں پانی کا ۔آپ اس کو دیکھئے تو عجیب رستخیز اور ہنگامہ کا عالم نظر آئے گا ۔ مگر یہ نہیں ہے کہ موجیں یہ دیکھ کر جائیں کہ ہمیں کس طرح اٹھنے کی ضرورت ہے ہمارے جانے سے کیا فائدہ مرتب ہوگا ۔ اس میں اغراض و فوائد مرتب نہیں ہو سکتے ۔ یہ نتیجہ ہے طبعی حرکت کا نہ کے ارادی حرکت کا ۔ لیکن اس سیدھی اور ٹیڑھی موجوں میں مقصد کا لحاظ بھی مضمر ہوسکے ۔یہ حرکت طبعی میں نہیں ہو سکتا ۔

ادراک و ارادہ میں ممکن ہے ۔ کیونکہ ادراک و ارادہ وہ چیز ہوتی ہے جو مقصد و غرض کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک شخص گرتا ہے اور ایک پھاندتا ہے جو کوٹھی پر سے پھاندے گا ۔اگر خودکشی منظور نہ ہو تو وہ دیکھ بھال کر اس طرح پھاندے گا کہ کوئی ضرب نہ آئے ۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی نگاہ یا اندازہ غلطی کرے ۔ مگر پیش نظر وہ اس کو رکھے گا ۔ لیکن جو شخص بے اختیاری طور پر گرے گا وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ کس طرح گروں۔ یہ کیا ہے ؟ یہی کہ وہ حرکت طبعی ہے اور یہ ارادی ہے ۔

قلم کاتب کا جو کتابت کرتا ہے تو وہ یہ لحاظ کرتا ہے کہ مجھے کس طرح چلنا چاہیے اور مرتعش کا ہاتھ جو حرکت کرتا ہے اسے یہ سمجھنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے کس طرح حرکت کرنا مناسب ہے ۔طبعی خواص سے بےشک شکلیں بنتی ہیں لیکن اغراض و مقاصد کا لحاظ غیر ممکن ہے ۔ پھر اگر تمام عالم کائنات اس طرح پر ہوتا جیسے ریگ کا وہ مجتمع ہوتا ہے تو ہم مان لینے کہ یہ صورت اس مادی قوت

جذب ودفع کا نتیجہ ہے ۔لیکن جس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز کی تخلیق میں مقصد کا لحاظ ہے۔نباتات اگر ہیں تو نباتات میں ان کی مناسبت سے رگ و ریشہ ہوتا ہے حیوانات میں ان کے لحاظ سے عروق و شرائین ہیں ۔

جس شے کی دنیا میں زیادہ ضرورت ہے وہ زیادہ پیدا کی گئی ہے جس کی کم ضرورت ہے کم پیدا ہو گئی ہے ۔ پانی چونکہ زیادہ ضروری تھا۔ اس لیے بہت زیادہ خلق کیا گیا ۔ زمین پر پانی ، زمین کے نیچے پانی، ہوا چونکہ ہر ذیحیات کے لیے زیادہ ضروری تھی اس لیے اس سے بھی زیادہ پیدا کی گئی ۔ سونا ، چاندی ، جواہرات ۔ چونکہ ان کی ضرورت کم تھی کم پیدا کئے گئے ۔ اس طرح سینکڑوں تفریقیں دنیا میں قائم ہیں ۔ اور سب اغراض و مقاصد کے لحاظ سے ہیں۔ ارادہ و اختیار کے بغیر ان کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی پھر جن چیزوں میں حیات پائی جاتی ہے وہ حیات تو ہرگز مادہ کا نتیجہ نہیں ہوسکتی ۔

آپ کا یہ کہنا کہ حیات بھی نتیجہ ہے ان ہی مادی چیزوں کے اجتماع کا۔اسی اجتماع سے ایک وقت میں حیات پیدا ہو تی ہے ۔ اس کی مثال یہ دیتے ہیں کہ بہت سی چیزیں جو متعفن ہو جاتی ہیں ان میں کیڑے پڑ جاتے ہیں ۔ یہ کیڑے غیر ذیحیات چیز سے پیدا ہوئے ۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ آج کل یہ تحقیق ہو گیا ہے کہ وہ کیڑے جو ہوتے ہیں وہ بھی عام ذیحیات چیزوں ہی کی طرح سے پیدا ہوتے ہیں اور نالیوں وغیرہ کے ذریعہ سے باہر آجاتے ہیں۔

جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ دنیا میں غیر ذیحیات مادے الگ ہیں اور ذیحیات چیزوں کا مبداء الگ ہے ۔ یہ حیات کہیں کہیں مخفی رہتی ہے ۔ مثلاً انڈا ہماری نظروں میں جماد چیز ہے ۔ مگر

تحقیق سے معلوم ہو گیا ہے کہ خود ذیحیات ہے ۔ اس میں وہ اثر حیات کے مضمر ہوتے ہیں اور یہی وہ ہوتا ہے جو منتقل ہوتا ہے اس بچہ کی طرف جو پیدا ہوتا ہے ۔ کہیں پر ذیحیات غیر ذیحیات سے نہیں ہوتا بلکہ ذیحیات ہی سے ذیحیات پیدا ہوتا ہے ۔اب اگر تاریخ ساتھ دے تو مادی نقطہ نظر سے تین مادے مان لیے جائیں ، مادہ ، قوت، حیات ۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ذیحیات چیز کو تاریخ بتلاتی ہے کہ وہ پہلے بلکل نیست تھی اب ہست ہوئی ہے ۔ اس بنا پر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مادہ تو تھا ہی ۔ یہ حیات مادہ میں کہاں سے آئی ؟

جب وہ کلیہ پیش نظر رکھ لیا جائے کہ کوئی چیز نیست سے ہست نہیں ہو سکتی عدم سے وجود کہیں پیدا نہیں ہوتا تو جس طرح سے مادہ مادہ کے لیے مبداء قرار پاتاہے اس لیے ازلی چیز ہے ۔ اسی طرح آپ کو ذیحیات اشیاء کے وجود کے لیے ایک سرچشمہ حیات تسلیم کرنا پڑے گا ۔ اور اسے ازلی ماننا پڑے گا۔ اسے ابدی ماننا پڑے گا ۔اور اسے غیر قابل زوال ماننا پڑے گا ۔پھر زیشعود چیزیں علم و ادراک یہ بھی مادی نقطہ نظر سے قابل توجہ نہیں ہے ۔ یہ کہنا کہ جیسے دو پتھروں کے رگڑنے سے شعلہ پیدا ہوا ویسے ہی ادراک ہے ۔

یہ طبعی خاصہ ہے ۔ میں کہوں گا کہ اگر ادراک اسی چیز کا نام ہے تو جس شے کا ادراک ہو وہ تو معلوم ہونا چاہیے مگر خود ادراک کا ادراک نہیں ہونا چاہیے ۔ کیونکہ ادراک ایک طبعی خاصہ ہے اور اس طبعی خاصہ کا نتیجہ ہے اس کے بعد کی منزل یعنی جس شے پر روشنی پڑے وہ منکشف ہوجائے۔لیکن خود یہ ادراک ۔ اس کا ادراک ہونا چاہیے کیونکہ یہ طبعی خاصہ ہے اور طبعی خاصہ ماتحت شعور نہیں ہوتا ۔ اس کے علاوہ وجدانیات یعنی خود اپنا احساس ، اپنے کیفیات و واردات قلبی کا احساس

یہ ایسی چیز ہے جو مستقل طور پر انسان میں موجود ہے اور یہ کسی طرح طبعی خواص پر منطبق نہیں ہوتا۔

☆☆☆☆☆

حیات اجسام کا سر ماغض

ڈاکٹر یعقوب صروف، مصر کے اکابر فلاسفہ و محققین میں سے تھے۔ 1927 میں انتقال کیا۔ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں جو مصر کے مجلہ المتصطف میں شائع ہوئی ہے۔ اس مسئلہ پر تبصرہ کیا ہے ۔ اس کا ترجمہ یہاں عرض کیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

کیمیاوی بحث و تحلیل کے بعد یہ خیال قائم کیا گیا ہے کہ حیوان و نباتات و جماد تینوں قسم کے اجسام ایسے جامد اور لاشعور ذرات سے مرکب ہیں جن میں ذاتا حیات و حرکت کا فقدان ہے اور کسی کیمیاوی طریقہ سے ان کا تجزیہ ممکن نہیں ہے؟ اس لئے انہیں بسیط کہا جاتا ہے۔ لیکن اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ ذرات اپنی ذاتی حیثیت سے حیات و حرکت ارادیہ سے محروم ہیں تو نباتات میں حیات اور حیوان میں اس کے ساتھ ساتھ حرکت ارادیہ کہاں سے پیدا ہوتی ہے ۔

مثلاً گیہوں کی اصل فطرت میں ایک مادہ حیات موجود ہے کہ جب اس کو مناسب زمین میں بویا جائے اور خارجی حالات بھی مواقف ہوں تو وہ مادہ حیات اپنے کام میں مشغول ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ حیات معرض فعلیت میں آکر گیہوں کے دانوں میں سرایت کرجاتی ہے اور تھوڑے دنوں میں نمو و تزاید کے برکات سے خاک کے پردہ کو چاک کرتی ہوئی بالیوں کی صورت میں ظاہر ہوکر ایک وسیع

پیمانہ پر بنی نوع بشری کے رزق کا سامان مہیا کرتی ہے لیکن وہ گیہوں جن کو بویا گیا ہے اگر از اول ایسے ہوں کہ جن میں طویل مدت گزرنے کے سبب قوت حیات فنا ہوچکی ہے۔تو لاکھ قوت جاذبہ اطراف و جوانب سے رطوبت کو جذب کرے لیکن کبھی ان میں نمو و تزاید پیدا نہ ہوگا۔ اسی طرح ایک تازہ انڈے کو روئی کے پہلوں کے اندر ایک خاص مدت تک رکھا جائے تو وہ کمزور مخلوق جو ان میں مضمر ہے اپنی قوت حیات کے باعث نمو پیدا کرکے کچھ ہی دنوں میں گوشت و پوست اور پر و بال سے آراستہ ہوکر ایک صحیح و سالم طائر کی صورت میں اپنی کال کوٹھری سے نکل کر ماں باپ کے پیچھے دوڑنے لگے گا۔

لیکن اسی انڈے کو کچھ زمانہ تک اگر کھلی جگہ پر ڈال دیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ مادہ حیات جو اس کے اندر ہے فنا ہو جائے۔ تو پھر لاکھ کوششیں صرف کی جائیں کبھی اس میں ایک طائر پیدا نہیں ہوسکتا۔آخر یہ قوت زندگی کہاں سے آتی ہے اور حیات کا بھید کیا ہے اور نمو اور تزاید کن اسباب کا نتیجہ ہے؟ ڈاکٹر یعقوب صروف جن کے ساتھ اس تقریر کے موقع پر دواؤں کا کافی ذخیرہ موجود تھا۔ انھوں نے کہا۔

دیکھئے !کاربن ایک بسیط عنصر ہے جس کی مختلف شکلیں ہیں جن میں سے مشہور کوئلہ ہے اور یہ سب کا سب آکسیجن میں جل جاتا ہے ہاتھ میں ایک کوئلہ لےکر یہ ایک ٹکڑا ہے اس کوئلہ کا جو بالکل جامد اور سیاہ ہے۔ آکسیجن ایک لطیف عنصر ہے، ہوا کی صورت، میرے ہاتھ میں جو دو شیشے ہیں۔ ان میں ایک میں ہوا بھری ہوئی ہے اور دوسرے شیشہ میں آکسیجن ہے۔ ظاہری صورت میں یہ دونوں یکساں ہیں اور کوئی فرق نہیں لیکن خواص کی حیثیت سے ان دونوں میں بڑا فرق ہے جیسا کہ ذیل

کے انکشافات سے آپ کو معلوم ہوگا۔یہ کہہ کر موصوف نے ایک شمع روشن کی۔ اور اس کو ایک شیشہ کے اندر جو ہوا سے مملو تھا داخل کیا، اس کی روشنی دھیمی پڑ گئی اور ذرا اوپر میں بجھ گئی۔ اس کے متعلق تھوڑی سی تقریر کرنے کے بعد دوبارہ شمع روشن کی اور اس کو دوسرے شیشہ میں داخل کیا کہ جس میں آکسیجن بھرا ہوا تھا۔

اس شمع کی روشنی زیادہ ہوگئی اور تو بڑھ گئی اس کے بعد ایک کوئلہ کے ٹکڑے میں اپنے سامنے کے چراغ سے آگ دینا چاہی۔ مشکل سے ایک گوشہ میں اس کے ذرا آگ لگی۔ لیکن چراغ سے دھوان جلنے کے بعد وہ آگ قریب تھا بجھ جائے۔ فوراً اس کو آکسیجن والے شیشہ کے اندر داخل کیا۔ اس میں سے شعلے نکلنے لگے۔ اور نمایاں روشنی ظاہر ہوئی۔ تیسری بار تھوڑی سی روئی ایک آہنی سلاخ میں لپیٹ کر آگ سے روشن کی اور آکسیجن کی بوتل میں اس کو داخل کیا۔

دفعتاً اس کی روشنی زیادہ ہوگئی۔ان تجربوں کے واضح طور پر بیان کرنے کے بعد کہا کہ آپ حضرات کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ آکسیجن میں ذاتی طور پر خاصہ ہے کہ وہ آگ سے روشن اجسام کو قوت پہنچا کر ان کی روشنی اور اشتعال کو زیادہ کردے۔ اگر موقع ہوتا تو میں آپ کے سامنے واضح کردیتا کہ آکسیجن اکثر دیگر اجسام کے جلانے کی بھی قوت رکھتا ہے۔ اگرچہ وہ بذات خود بارد ہوں۔ ہیڈروجن بھی مثل آکسیجن کے شفاف عنصر ہے ۔

لیکن اس سے زیادہ مبک ہے۔ اور اس کے خواص میں سے یہ ہے کہ آکسیجن کے ساتھ متحد ہونے کے بعد ان دونوں سے پانی پیدا ہوجاتا ہے، دنیا میں جتنا پانی ہے خواہ وہ دریا میں ہو یا کنوؤں کے اندر

یا ابر کے دامن میں ضرور ان دو عنصروں سے مرکب ہے۔ چوتھا عنصر نائٹروجن ۔ یہ بھی سابق دو عنصروں کے مثل شفاف اور لطیف ہے لیکن اس کے خواص اور آثار ان دونوں سے بالکل مختلف ہیں۔یہ آکسیجن کے ساتھ متحد ہوجاتا ہے اور ان دونوں کے اتحاد سے سخت ترین تیزاب تیار ہوتا ہے جن میں سب سے زیادہ شدید دہ تیزاب ہے جو چاندی اور اکثر معادن کو گلا دیتا ہے اور جاندار اشیاء سے قوت حیات کو فنا کردیتا ہے۔

سابق کے بیانات سے معلوم ہوچکا ہے کہ ذیحیات اجسام کے جراثیم ان ہی چار عنصروں سے مرکب ہیں ۔ لیکن جب ان عناصر کے خواص و آثار پر نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ہی مرتب اگر آکسیجن ہیڈروجن کے ساتھ متحد و مخلوط ہو جائے تو اس سے صرف پانی پیدا ہوسکتا ہے اور اس صورت میں نائٹروجن اور کاربن بالکل بے تاثیر رہ جائیں گے ۔اور اگر کاربن آکسیجن کے ساتھ متحد ہو جائے تو اس میں بالکل جل کر ایک خاص قسم کے زہر کی صورت اختیار کر لیگا۔ اسی طرح اگر کاربن اور ہیڈروجن میں اتحاد پیدا ہو جائے تو ایک جل اٹھنے کے قابل مادہ اس سے تیار ہوگا اور اگر کہیں نائٹروجن اور آکسیجن میں اتحاد ہوگیا تو ایک سخت ترین تیزاب موجود ہوسکے گا۔

اب اگر ان چاروں عناصر کو متحد کردیا جائے تب بھی مذکورہ بالا اشیاء کے سوا کسی چیز کا حاصل ہو جانا ناممکن ہے۔پانی ہویا زہریلا گیس یا قابل اشتعال مادہ یا تیزاب۔ یہ سب روح حیات سے مصرا ہیں اور ان میں زندگی کا پتہ نہیں بلکہ اکثر ان میں سے زندگی کے دشمن اور اس کو فنا کردینے والے ہیں۔ پھر کون وہ ہستی ہے جو قانون طبیعت کی مخالفت کرتے ہوئے ان چاروں عناصر کو ترکیب دے کر ایک ذیحیات شئے کو موجود کر دیتی ہے اور ہمیشہ اس کے نظام ترکیبی کی نگہداشت کرتے ہوئے اس

کے شیرازہ کو منتشر ہونے سے روکتی رہتی ہے کہ جس کے سبب سے اس کی ترکیب میں خلل نہیں واقع ہوتا اور جو اصول مقرر کردیا گیا ہے اس سے یکسر موِ متجاوز نہیں ہوتا اور کون وہ ہے جس نے ان ذرات کو اتنی قوت عطا کردی ہے کہ وہ نبات میں نبات، طائروں میں طائر، انسان میں انسان کی تخلیق کرسکیں اور کون ان کے اعمال کی نگہداشت کرتا ہے کہ کبھی اس میں غلطی نہیں ہوتی ۔ جبکہ فلسفہ نے طے کردیا ہے کہ یہ ذرات ذاتا یکساں ہیں۔

اور ان کی ترکیب بھی تمام اقسام حیوان و نبات میں ایک ہی طرح پر ہے۔ پھر اگر ارادہ خداوندی اس نظام میں تفریق کا زمہ دار نہ ہو تو جسم کے زرات کو کون روک سکتا ہے ۔ اس سے کہ وہ صرف گوشت کی تکوین کریں۔ اس وقت پورا جسم گوشت کا بن جائے گا کہ جس میں ہڈی کا پتہ نہیں یا صرف ہڈی کی خلقت ہو کہ تمام جسم صرف ہڈی کا بن جائے جس میں گوشت کا نشان نہ ہو یا صرف خون پیدا ہو اور پورا جسم ایک خون کا ٹکڑا بن جائے جو کچھ دن بعد متعفن ہوکر دور دور کے لوگوں کو اذیت پہنچانے لگے ۔ کیونکہ فلسفی تحقیقات نے ان جراثیم کے طبعی خصوصیات کو متحد بتایا ہے پھر ان کے تاثیرات میں گوناگوں اختلاف کیا معنی رکھتا ہے ۔

تسلیم کرنا پڑے گا یہ پورا نظام ایک مقتدر مصلحت میں خالق کے ہاتھ میں جو تمام عناصر و جراثیم کو اپنے ارادہ کے مطابق ترکیب دیتا، حرکت میں لاتا، اور موجود بناتا ہے۔ حیات اجسام کا مسئلہ اتنا غامض ہے جہاں عقل ششدر اور حیران رہ جاتی ہے ۔ یہ اجسام کہ جن میں حیات و ارادہ یا تنہا حیات و دیت رکھی گئی ہے۔ کیمیاوی ذرائع سے ان کی تحلیل کر ڈالئے اور موجودہ فلسفہ عملیات کے تمام بہترین آلات سے ان کے شیرازہ کو منتشر کردیجئے تو چاروں عنصر بسیط ہوکر علیحدہ علیحدہ ہو جائیں

گے مگر وہ حیات کہ جو اس مجموعہ میں پائی جاتی تھی مفقود ہو جائے گی اور یہ عناصر مثل دیگر جمادات کے بے حس اور جامد ہو جائیں گے ۔پھر اگر دنیا کے تمام ذرائع صرف کردیئے جائیں اس کوشش میں کہ یہ عناصر جس طرح پہلے تھے اسی طرح دوبارہ ترکیب دے دیئے جائیں تو یہ امر دشوار بلکہ محال ہے ۔ عناصر سب موجود ہیں مگر وہ حیات کہ جو ان میں مضمر تھی تحلیل کے بعد بالکل مفقود ہوگئی اور اس کا نشان تک بھی معلوم نہ ہوتا اور نہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ان میں کس طرح قائم تھی اور اب کہاں چلی گئی۔کیمیاوی آلات و ذرائع یہاں پہنچ کر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

سپر انداختہ ہوکر شکست کا اعتراف کرتے ہیں ۔ اب انسان مجبور ہوکر دوسرے قسم کے اسباب تحقیق کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس راز کے معلوم کرنے کے لئے ذرہ بیں چھوٹی چیزوں کو بڑا کر کے دکھانے والے آلہ سے بہتر کوئی چیز نظر نہیں آتی ۔ یہ وہ آلہ ہے جس کے ذریعہ سے موجودہ زمانہ میں بڑے بڑے مشکل ترین مسائل فلسفہ طبیعیات کے حل کر دیئے گئے ہیں ۔ اور وہ اسرار و غوامض دریافت کئے گئے ہیں ۔ جن تک فکر انسانی پہنچنے سے قاصر تھی۔اس آلہ کی صنعت اس کمال کی حدتک پہنچی ہے کہ ایک چھوٹی سے چھوٹی چیز ہزار ہزار درجہ بڑی ہوکر نظر آنے لگتی ہے ۔ یقیناً حکماء طبیعیات کے لئے اس سے بڑھ کر راز حیات کے دریافت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے ۔

ان کو مجبور ہوکر اس کے دامن میں پناہ لینا پڑی تو یہ نتیجہ نکلا کہ ان تمام اجسام کے اندر جن میں حیات و دیعت رکھی گئی ہے ۔ ایسے چھوٹے چھوٹے کیڑے موجود ہیں جو انتہائی باریک شفاف اور رنگ سے خالی ہیں ۔لیکن طاقتور ترین آلات مکبرہ سے طویل زمانہ تک غور کے بعد بھی ان کیڑوں میں اعضاء نظر نہیں آئے اور نہ ان کی شکل تمام اقسام نبات و حیوان میں یکساں دکھلائی دی۔ ہاں یہ دیکھا

گیا کہ کیڑے برابر متحرک ہیں اور ایک لحظہ بھی ساکن نہیں ہوتے اور مستقل طور پر خارجی غیر ذیحیات عناصر کا استفادہ کر کے ان کو ایسے محیر العقول طریقہ سے ذیحیات بنادیتے ہیں جس کا آج تک علمی دنیا کو انکشاف نہ ہوسکا۔پھر ان سے باریک خطوط اعصاب یا شریان ،یا استخوان یا عضلات کی صورت میں پیدا ہوکر ایک جال اعصاب و شرائین وغیرہ کا پھیل جاتا ہے۔ لیکن اس صورت سے کہ جو کیڑے استخوان بنانے کا کام کررہے ہیں ۔

وہ اعصاب کی طرف رخ نہ کرینگے اور اسی طرح جو جراثیم درخت میں برگ کی ایجاد کرنے والے ہیں کبھی ثمر کی صورت نہیں پیدا کرتے اور اسی پر تمام اجزائے نبات کا قیاس کرنا چاہیے۔لیکن حیرت کی اس وقت انتہا نہیں رہتی جب علمی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ برگ و گل، شاخ و ثمر ، اور حیوانات میں گوشت و پوست و شرائین و عروق کے مادی اجزاء تمام اقسام نباتات و حیوانات میں یکساں ہیں اور حیات کے ہر دور میں یکساں طور پر باقی رہتے ہیں ۔ اور اکثر جو خارجی غذا ان مواد تک پہنچی ہے وہ بھی متحد ہے ۔

مگر باوجود اس کے عجیب نظام قائم ہے کہ بعض ذرات دوسرے ذرات کے عمل میں کوئی مزاحمت و دخل اندازی نہیں کرتے اور تقسیم عمل کے کام کو ایک منظم قانون کے ماتحت انجام دے رہے ہیں۔جس کے نتیجہ میں ایک پورا درخت یا حیوان پیدا ہو جاتا ہے ۔پھر جب یہ کیڑے اعضاء کی خلقت کو تمام کر دیتے ہیں تو ان کو چھوڑ کر علیحدہ نہیں ہو جاتے بلکہ خود مختلف حصوں میں تقسیم ہو کر گوشت وپوست اور برگ و ثمر میں منتشر ہو جاتے ہیں ۔یہاں تک کہ وہ جسم کے ہر ہر چپہ میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں اور کوئی حصہ جسم کا اگرچہ وہ اس کا ہزاروں جزو کیوں نہ ہو ان سے خالی

نہیں ہے۔ اور یہ امر بھی یقینی ہے کہ ان کیڑوں کی پیدائش بھی اصل میں کچھ ذیحیات کیڑوں سے ہوتی ہے ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام کیڑوں میں حیات کہاں سے آتی ہے اور آس پاس کے غیر ذیحیات مواد پر یہ حیات کا فیضان کس طرح کرتے ہیں اور کس اصول کی بناء پر یہ بعد میں کثیر حصوں میں منقسم ہو کر منتشر ہو جاتے ہیں ۔

کس عنوان سے پوری باریک بینی اور امتیاز کے ساتھ تقسیم عمل کے فرض کو انجام دے کر مختلف النوع اجزائے بدن کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں۔ باوجود یہ کہ ان کی حقیقت ماہیت اور خاص سب یکساں ہیں ۔یہاں چونکہ تمام خداوندان حکمت کو سر عجز خم کر دینا پڑتا ہے اور اعلان کرنا پڑتا ہے کہ بے شک ہم راز حیات کو نہیں سمجھے اور اصرار زندگی کا دریافت کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ۔ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حیات ان کیڑوں کا لازم ذات ہے کیونکہ موت کے بعد انہی کیڑوں سے حیات رخصت ہو جاتی ہے۔ بلکہ ماننا پڑے گا کہ حیات ان میں ایک خارجی عرض ہے جو کسی مبداء فیاض سے ان کو عطا ہوتا ہے۔اور پھر سلب کر لیا جاتا ہے۔

یقیناً اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حیات کسی قدرتی تخلیق و ایجاد کی ممنون احسان ہے اور ہر معلول کے لیے علت کے اصول پر ذیحیات اشیاء کی زندگی ایک خدائے حی و قادر و حکیم کے وجود کی گواہ ہے۔ خدائی نظام قدرت کے انکار کرنے والے بہت کوششوں سے ایسی شاز و نادر مثالوں کے دریافت کرنے کی زحمت اٹھاتے ہیں جہاں کچھ عجیب و غریب اتفاقات پیش آگئے ہیں یا غیر طبعی صورتیں پیدا ہوئی ہیں ۔جیسے عورت کے شکم سے جانور کا بچہ پیدا ہو یا ایک چیز کی زراعت پر دوسری جنس کی چیز پیدا ہو جائے۔یا دوسرے کا بچہ اور چھ انگلیوں کا آدمی اور اسی طرح کی صورتیں جہاں کوئی جزو زیادہ

ہو گیا ہے یا کوئی جزو کم۔ ان تمام چیزوں کو پیش کیا جاتا ہے اس ثبوت میں کہ یہ دنیا کسی قادر و دانشمند کی کارگردگی کا نتیجہ نہیں ہے ۔

مگر حقیقتاً یہ ایک تنکے کا سہارا ہے ڈوبنے والے کے سامنے اس لیے کہ میں نے مادہ کے متحد !الطبیت ہونے کی جو دلیل پیش کی تھی اس کی بناء پر اس دنیا میں مختلف چیزوں کی ایک دوسرے سے علیحدگی کا کوئی نظام قائم ہی نہیں ہونا چاہیے تاکہ اس کی بناء پر کوئی شے غیر طبعی قرار پائے ۔ مذکورہ صورتوں کا غیر طبعی کہا جانا خود دلیل ہے اس کی کہ کوئی نظام قائم ہے۔پھر ایک نظام کے جاری ہونے کے ساتھ اس کے خلاف صورتوں کا بھی کبھی کبھی رونما ہو جانا تو مادین کے خلاف خود ایک دلیل کا اضافہ کرتا ہے ۔

وہ یوں کہ اگر مادہ کے تمام اجزاء تمام اشیاء میں طبیعت و حقیقت کے لحاظ سے بالکل متحد ہیں تب تو میں نے کہا کہ کائنات میں کوئی اختلاف ہونا ہی نہ چاہیے تھا اور یہ نظام ہی نہیں قائم ہونا چاہیے۔اور اگر ایسا ہے کہ ہر ہر شے کے ذرات اپنی طبیعت و خاصیت کے لحاظ سے ذاتی طور پر اسی شے کی تشکیل کر سکتے ہیں دوسرے کی نہیں تو اس کے خلاف صورت کبھی پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے اس سے ناممکن ہونا چاہیے اور ناممکن بات شاذ و نادر طریقہ سے بھی دافع نہیں ہو سکتی۔ اس لیے مذکورہ بالا مثالیں بھی خدا کے وجود کی ایک دلیل ہیں اور انہیں اسی قادر و خلاق ہستی کے مظاہر قدرت کا ایک نمونہ سمجھنا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

خدا کی صفات

ان ہی وجوہ کی بناء پر جن سے میں نے مادہ کا خلقت کائنات کے لیے ناکافی ہونا ثابت کیا ہے آپ کو خدا کے صفات کا بھی ایک حد تک علم ہو جائے گا ۔ مادہ اس لیے کائنات کے وجود کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ بے ثبات چیز ہے اور اس میں حرکت کی وجہ سے نیستی کا پہلو شریک ہے ۔ نیز یہ کہ وہ غیر ذیحیات اور بےحس و شعور ہے ۔ اس لیے دنیا کے حکیمانہ نظام کی تشکیل کا سبب نہیں قرار دیا جا سکتا ۔معلوم ہوا کہ خدا کیسا ہے وہ سراسر ہستی ہے یعنی اس میں کسی طرح نیستی شریک نہیں ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ہر حیثیت سے کامل ہے کیونکہ نقائص اور خرابیاں سب نیستی کے پہلو سے پیدا ہوئی ہیں ۔

وہ مرکب نہیں ہے یعنی اس کے اجزاء نہیں پائے جاتے کیونکہ اس صورت میں وہ ان اجزاء کا محتاج ہو گا اور وہ اجزاء اس سے مقدم ہونگے ۔ لہذا وہ سب کا پیدا کرنے والا نہیں قرار پا سکے گا ۔سابق زمانہ کے مادیں بھی چونکہ مادہ کو اصل اشیاء قرار دینا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے مادہ کو غیر قابل تقسیم اجزاء کا نام قرار دیا تھا ۔ کیونکہ اگر اس میں اجزاء پیدا ہوں تو پھر وہ اجزاء کا محتاج ہو گا اور یہ اجزاء اس کے پہلے ہونگے ۔

ان اجزاء سے قطع نظر رکھ کر اس کا وجود کوئی چیز نہ رہے گا ۔ اس لیے ازلی و ابدی ماننے کے لیے مادین کو بھی ضرورت پڑی کہ وہ اجزاء فرض نہ کریں ۔ اس لیے جواہر مردہ کے وجود کو فرض کیا ۔ حالانکہ جیسا کہ میں نے بیان کیا سالمات مادہ جو ناقابل تجزیہ ہیں ان کو دیکھا نہیں جا سکتا ۔ لیکن

صرف اس لیے مان لیا گیا کہ اگر ایسا نہ ہو گا تو وہ قابل زوال ہونگے ۔اسی طرح ایتھر کو بسیط قرار دیا گیا کیونکہ اگر اس میں اجزاء پائے گئے تو وہ قدیم نہ ہوگی ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شے اجزاء رکھتی ہو وہ ازلی و ابدی نہیں ہو سکتی ۔ آپ نے خدا کو مانا ۔ اور خدا کو ازلی ابدی تسلیم کیا تو اب اس کو مرکب ماننے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی ۔

☆☆☆☆☆

نفی جسمیت

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا جسم نہیں ہے کیونکہ جب جسم ہو گا تو اس میں اجزاء اور مقدار کا پایا جانا ضروری ہو گا ۔ جسم اس کو کہتے ہیں جس میں طول عرض عمق ۔ یعنی لمبان ۔ چوڑان ۔ منان پائی جاتی ہو ۔ جس میں یہ چیزیں پائی جاتی ہوں اسی کو جسم کہتے ہیں ۔ تو اب خدا اگر جسم ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں لمبان چوڑان منان پائی جاتی ہے۔ اور اسی کے ساتھ اسی مکان کی احتیاج پیدا ہوگی ۔ وہ محتاج قرار پائے گا اور محدود ہو جائے گا ۔

اس صورت میں وہ اول ہر اول کا نہ رہے گا ۔ اس لیے کہ وہ محتاج محل ہے تو پہلے محل مانئے پھر اس کو مانئے ۔جب وہ محتاج مکان ہے تو پہلے مکان مانئے پھر اس کو مانئے ۔یہ تمام چیزیں اس کے پہلے سے ہونگی ۔ وہ اس کے بعد ہوگا ۔تو اب وہ قدیم کہاں رہا اور موجود بالذات کہاں رہا ۔

☆☆☆☆☆

ابطال رویت

جب جسم نہیں ہے اور مکان و چیز میں محدود نہیں ہے تو اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ اس کی رویت غیر ممکن ہے ۔ یعنی آنکھوں سے دیکھنا اس کا ممکن نہیں ہے کیونکہ دیکھنا تو وہ چیز ہے جو ہر جسم سے بھی متعلق نہیں ہو سکتا بلکہ اس جسم سے مخصوص ہے جو لون و شکل رکھتا ہو اور قوت باصرہ کے مقابل ہو ۔ ورنہ اگر رنگ و شکل نہ ہو تو ہوئی چیز ہم کو دکھلائی نہ دے گی ۔

رنگ و شکل کے ساتھ روشنی ۔ یہ تین چیزیں وہ ہیں جن کی بناء پر چیزیں ہم کو نظر آتی ہیں ۔ اگر کوئی شے جسم ہی نہیں رکھتی ہے تو رنگ کہاں قائم ہو گا۔کیونکہ رنگ تو ایک عرض ہے جو بغیر محل نہیں ہو سکتا ۔ اور شکل کا ہے میں پیدا ہوگی جب خدا جسم ہی نہیں ہے پھر میں تو کہتا ہوں کہ مستقل طور پر یہ محل بحث قرار دینا کہ رویت ممکن ہے یا نہیں اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ غصہ کیوں نہیں دیکھائی دیتا۔اس لیے کہ جسم نہیں ۔ درد دیکھیئے آنکھ سے ۔

آپ کہیئے گا کہ کیا وہ جسم ہے جو دکھائی دے ۔ آواز آنکھ سے دکھایئے ۔ نہ دیکھلائی دے گی ۔ باوجود یکہ ہے ۔ اس لیے کہ جسم نہیں ہے ۔ گرمی و سردی آنکھ سے دکھایئے ۔ نہیں دکھلائی دے گی۔ اس لیے کہ قوت لامسہ سے متعلق ہے ۔ جسم نہیں ہے جو آنکھ سے دکھائی دے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ دکھلائی دنیا وجود کا لازمہ نہیں ہے ۔

کیونکہ یہ سب چیزیں موجود ہیں مگر دکھلائی نہیں دیتیں ۔ ہوا نہیں دکھلائی دیتی ۔ باوجود یہ کہ جسم ہے ۔اس لیے کہ لطافت رنگ کے قائم ہونے سے مانع ہے۔ دنیا میں خلا محال مانا گیا ہے ۔ اس کے

معنی یہ ہیں کہ ہر مقام پر کچھ نہ کچھ ہوا ہے ۔ جو گھیرے ہوئے ہے فضا کو لیکن ہم کو نہیں دکھلائی دیتی ۔اس لیے کہ وہ جسم ہے ۔مگر لطیف جسم ہے تو نظر نہیں آتا۔اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ موجود ہونے کے لیے دکھائی دینا ضروری نہیں ہے بلکہ دکھائی دینے کے لیے جسم ۔ رنگ ۔ شکل کا ہونا ضروری ہے ۔ اس کے ساتھ لطافت اتنی نہ ہو کہ جو قطر کے قائم ہونے سے مانع ہو۔اس کے بعد وہ شرائط ہوں جو ہر دیکھنے کے قابل چیز کے لیے ضروری ہیں ۔

یعنی وہ مقابل ہو ۔ اتنا دور نہ ہو کہ نگاہ کام نہ کرے اور اتنا قریب نہ ہو کہ نگاہ کو چھپا لے ۔ اگر کوئی شے جسم بھی ہے اور ان تمام شرائط کو نہیں رکھتی تو نہ دیکھائی دے گی ۔پھر خدا جو جسم بھی نہیں ہے ۔ کسی مکان میں بھی نہیں ہے ۔ کسی جہت میں بھی نہیں ہے ۔ محدود بھی نہیں ہے رنگ و شکل بھی نہیں رکھتا ۔وہ دیکھائی کیونکر دے سکتا ہے ۔ بالکل عقل کے خلاف ہے ۔

اس صورت میں اگر کسی آیت یا روایات میں رویت کی لفظ کا اس کی نسبت استعمال بھی کیا جائے تو اس سے مجازی معنی مراد لیے جانا چاہیں جو اس کی ذات سے متعلق ہو سکتے ہوں ۔کیونکہ ہر چیز کا دیکھنا اس کے اعتبار سے ہوا کرتا ہے ۔ اگر آنکھ سے دیکھنے کی چیز ہے تو آنکھ سے دیکھی جائے گی۔ لیکن اگر کوئی شے آنکھ سے دیکھنے کی نہیں ہے ۔

چونکہ دیکھنا انسان کے لیے ذریعہ یقین ہے ۔ اس لیے اس کے انتہائی یقین کو ثابت کرنے کے لیے دیکھنے کے لفظ کا استعمال صحیح ہو گا ۔ لیکن اس کو ان معنوں میں استعمال کرنا کہ وہ آنکھوں سے دکھلائی دیتا ہے غلط ہو گا ۔ کون سی چیز ہے جس کا یقین ہو اور انسان کو وہ مثل دیکھی ہوئی باوس کے معلوم

نہ ہوتی ہو بلکہ دیکھی ہوئی باتوں میں تو شبہ کا خطرہ ہوتا ہے ۔لیکن بہت سی ان دیکھی باتیں اتنی یقینی ہوتی ہیں کہ ان میں شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی ۔ نگاہ تو کبھی غلطی بھی کرتی ہے ۔

وہ شخص جو چاند کے دیکھنے کا اشتیاق میں کھڑا ہوا ہو ۔ نہ معلوم کتنے چاند دیکھ لیتا ہے ۔ اور خیال بھی کر لیتا ہے کہ میں نے چاند دیکھا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیکھنے میں بھی انسان کو دھوکا بھی ہوتا ہے۔لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ جو مکہ معظمہ نہیں گئے ہیں ان کو خبریں پہنچتی ہیں کہ مکہ معظمہ کوئی چیز ہے ۔ اگر ان سے کہا جائے کہ آپ نے آنکھ سے تو دیکھا نہیں ہے کہ مکہ معظمہ کوئی چیز ہے تو وہ اس معاملہ میں کسی شبہ کو قبول نہ کرینگے ۔ چاند کے دیکھنے کو چاہے شبہ کی نظر سے دیکھیں مگر وہ مکہ معظمہ کے لیے کہیں گے کہ دیکھنے سے بڑھ کر درجہ ہے ۔

معلوم ہوتا ہے کہ یقین کا درجہ وہ ہے جو دیکھنے سے بڑھ کر انسان کے ذہن میں استحکام رکھتا ہے۔ان معنوں سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مومنین اپنے خدا کو دیکھتے ہیں درصور تیکہ ہمارے قلوب ہمارے ادراکات ۔ ہمارا ضمیر اس کے وجود کے احساس سے پر ہے ۔ تو آنکھیں اس کو نہیں دیکھتیں ۔ مگر جسم کا ہر ہر ذرہ اس کو دیکھتا ہے ۔ اور اس بناءپر کہا جاتا ہے کہ اسے ہم نے دیکھا ہے ۔ چنانچہ جب امیر المومنین سے پوچھا گیا "هَلْ رَأَيْتَ رَبَكَ" ۔

ترجمہ:"کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے"؟ آپ نے فرمایا " فَكَيْفَ أَعْبُدُ اللهَ الَّذِي لَم أَرَهُ"۔ ترجمہ: "پھر میں عبادت کیسے کرتا ہوں اس خدا کی جس کو دیکھا نہیں" ۔ اس کے بعد ہی آپ نے فرمایا ۔ "لا تَرَاهُ العُيونُ بِنَواظِرِ الأَبْصارِوَلَكِن تَرَاهُ الْقُلوبُ بِحَقَائِقِ الْإِيمَانِ "۔

ترجمہ:" آنکھیں اس کو اپنی نگاہ سے نہیں دیکھتیں لیکن دل اس کو اپنے ایمان کے ساتھ دیکھتے ہیں"۔اس کا کمال معرفت ، اس کے وجود کا کمال علم و یقین بس یہ ہے اس کے لحاظ سے دیکھنا۔ مادی دیکھنا غیر مادی چیز میں تلاش کیا جائے تو غلطی ہے ۔ مادی چیز کا دیکھنا بھی مادی ہے ۔ اور غیر مادی چیز کا دیکھنا بھی غیر مادی ہے ۔چاہیے لفظ آپ صرف کر دیجیے ۔ مگر حقیقت نہ بدلیئے ۔ کیونکہ لفظیں تو ہماری بنائی ہوئی ہیں ۔ معنی ہمارے اختیار سے باہر ہیں ۔ امام سے دریافت کیا گیا۔

کیا بندہ خدا کو روز قیامت دیکھیں گے ؟ آپ نے فرمایا اور وجود کے پہلے بھی تو اس کو دیکھا تھا عالم الست میں ۔ اس نے کہا اچھا ! اس وقت بھی دیکھا تھا ؟ ایک تھوڑی سی خاموشی کے بعد آپ نے فرمایا۔ کیا مومن اس دنیا میں نہیں دیکھتا اس کو؟ وہ حیران ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے ۔ تحیر کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا اس دنیا میں بھی تو مومنین دیکھتے ہیں ۔ آخر میں آپ نے فرمایا کہ یہ آنکھیں اس کا مشاہدہ نہیں کرتیں ۔ دل اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔اگر رویت کے معنی انتہائی معرفت کے لیے جائیں تو نزاع کی گنجائش نہیں ہے ۔

اس حیثیت سے بیشک جتنے پردے مادی ہٹتے جائیں گے اتنی ہی اس کی معرفت انسان کو کامل ہوتی جائے گی اور جس وقت کہ یہ عالم کا دور ختم ہو جائے گا۔"فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ" ترجمہ :"بے شک تو اس چیز سے غافل تھا چنانچہ ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا ہے لہٰذا آج تیری نگاہ بہت تیز ہے"۔(سورہ ق: 22). یعنی وہ حجاب غفلت کے جو آنکھوں پڑے ہوئے تھے دور ہوگئے ۔اور وہ حقیقتیں جو محل شک میں تھیں محاسد یقین میں آ گئیں ۔ ان معنوں سے چاہے آپ کہیے گا کہ روز قیامت بندے خدا کو دیکھیں گے ۔ لیکن یہ مومنین سے مخصوص نہیں ہے ۔پردے تو

اصل میں کافروں کی آنکھ سے اٹھیں گے ۔ رہ گئے مومنین موقنین ۔ ان کی آنکھوں پر سے اس دنیا میں بھی پردے اٹھے ہوئے ہیں ۔

☆☆☆☆☆

صفات سلبیہ کی اہمیت

میں نے عجیب ترتیب قرار دی اپنے بیان میں کہ صفات سلبیہ کو مقدم کر دیا صفات ثبوتیہ پر ۔ کتابوں میں اس کا عکس ہوتا ہے ۔میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ سلب ان چیزوں کا انسان کو متوجہ کرتا ہے اس کے کمال کی جانب ۔انسان جب ان نقائص کو دور کرتا ہے خدا کی ذات سے تب وہ قریب ہوتا ہے اس کی معرفت سے اسی وجہ سے آپ قرآن مجید میں ملاحظہ فرمایئے تسبیح پر زیادہ زور دیا گیا ہے بہ نسبت حمد کے تسبیح کے معنی ہیں نقائص سے اس کو بری کرنا۔

حمد کے معنی ہیں کمالات کا ثابت کرنا۔ قرآن مجید میں ملاحظہ فرمایئے کہ وہ کم مقامات ہیں جہاں اس کے حمد پر زور دیا گیا ہے لیکن تسبیح کے لیے مختلف طریقے یسبح اللہ۔ سبح اسم ۔سبحان الذی۔سبح اللہ ۔اسی طرح سے مختلف مقامات پر تسبیح سے سوروں کی ابتدا کی ہے تاکہ اس کی ذات سے نقائص کو دور کرے۔اور اگر کسی نے اس کو نقص سے نسبت دی تو زبان پر تو ہوگا لفظ خدا کا مگر حقیقت اعتقاد اس سے متعلق نہیں ہوگا ۔

اگر انسان نے اس کی تعریف کو کچھ نقائص کے ساتھ مخلوط کر دیا تو اب وہ ہستی جو تمہارے دل و دماغ میں آئے گی وہ حقیقتاً خدا نہ ہوگا ۔جس کی اس عالم تکوین میں ضرورت ہے لیکن ہم اگر کہیں

کہ وہ جو ان نقائص سے بری ہے لیکن اس کے آگے ہم کچھ نہ بتا سکیں تو ہم نے چاہے اس کا وصف نہ بیان کیا ہو لیکن پھر بھی کسی نہ کسی حد تک اس کی ہستی کا پتہ دے دیا اس سے معلوم ہوا کہ سب سے زیادہ اہم ہے انسان کے لیے ان باتوں کا سمجھنا جو خدا میں نہیں ہونا چاہئیں۔ان باتوں کا اشتراع ہی ذریعہ ہو گا اس کے کمال تک انسانی حدود میں پہنچنے کا مثلاً اگر جسم و جسمانیات کو تم نے خدا کی ذات سے دور کر دیا تو نقائص جتنے تھے وہ اس کی ذات سے الگ ہو گئے۔

اس لیے کہ ایک چیز ہے وجود یعنی ہستی ۔اور ایک چیز ہے اس کا محدود ہونا۔ یہ خرابیاں جتنی پیدا ہوتی ہیں سب محدود ہونے سے پیدا ہوتی ہیں اور تنہا وجود کو جہاں تک دیکھئے کمال ہی کمال ہے۔ جس میں نقص کی گنجائش نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

صفات زائدہ کا ابطال

جب وہ سراسر ہستی ہے تو پھر اس کے لئے احتیاج و تہید ستی کہیں سے پیدا نہیں ہو سکتی اس سے ایک اور نتیجہ بہت آسانی سے نکلتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے کمال کے فرض کرنے کے لیے الگ ہے صفتیں ملانے کی ضرورت نہیں ہے ۔کیونکہ علیحدہ سے صفتیں جب ملائی جاتی ہیں کہ خود وجود بجائے خود مکمل نہ ہو ۔

مثلا میں اپنی تئیں بحیثیت انسان کے دیکھوں تو انسان جاہل بھی ہو سکتا ہے۔ عالم بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی بحیثیت ذات اس کی ضرورت نہیں ہے کہ چیزیں معلوم ہی ہوں۔ لہذا ضرورت ہے کہ انسان کے

آگے میں کسی اور چیز کا تصور کروں جس کا نام ہے علم ۔تو انسان ایک چیز ہے اور اس کا علم دوسری چیز ہے اگر علم کا الگ سے تصور نہیں کرتے تو تنہا اس کی ذات ذمہ دار نہیں ہے۔

اشیاء کو معلوم کرنے کی۔ اسی طرح انسان کو ہم دیکھیں تو چونکہ وہ عاجز بھی ہو سکتا ہے۔ قادر بھی ہو سکتا ہے معلوم ہوا کہ تنہا انسان کی ذات قدرت رکھنے کی ذمہ دار نہیں ہو سکتی ۔لہٰذا اس کی ذات کے آگے بھی کسی چیز کی ضرورت ہے۔ اس کو میں کہوں گا کہ صفت ہے ۔جس کا نام ہے قدرت انسان کی ذات کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ زندہ بھی ہو سکتا ہے۔ مردہ بھی ہو سکتا ہے ۔لہٰذا مجھے انسان کو ایک الگ چیز ماننا پڑے گا اور حیات ایک الگ چیز ماننا پڑے گی۔

اگر خدا کو بھی ہم یوں ہی مانیں کہ تنہا ذات ہے جس میں عاجز ہونے کی بھی گنجائش ہے اس کی ذات کو دیکھتے ہوئے اس میں عدم کی بھی گنجائش ہے اس کی ذات کو دیکھتے ہوئے اس میں جلیل ہونے کی بھی گنجائش ہے اس کی ذات کو دیکھتے ہوئے تو بے شک اس کی ذات سے الگ اس کی ذات ہے ماوراء اس کی ذات سے علیحدہ صفتیں قرار دینا پڑیں گی۔

خدا ایک تو ذات ہوا پھر کچھ اس کی صفتیں ہوئیں جو ذات کے علاوہ ہیں۔ علاوہ ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ذات بحیثیت ذات ان کمالات کی حامل نہیں ہے جو ان صفتوں سے متعلق ہیں۔ اور پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ چونکہ ذات ہمیشہ سے ہے۔ اگر یہ کمالات اس کے بعد ہوں تو ضرورت ہوتی ہے کہ ان صفتوں کے پہلے وہ جاہل ہو لہٰذا جس طرح ذات خدا کی قدیم ہے اسی طرح ان صفتوں کو بھی قدیم ہونا چاہیے۔تو اب ایک تو قدیم خدا کی ذات ہے اور آٹھ قدیم اس کی صفتیں

ہوئیں۔عالم۔قادر۔مدرک۔ حی۔ سمیع۔ بصیر ۔مرید وکارہ ۔متکلم۔ تو ایک تو خدا ہوا ۔اور یہ آٹھ صفتیں ہوئیں ۔لیکن یہ آٹھوں صفتیں جو قدیم ہوئیں ان سے نظر کو ہٹا کر دیکھیں خدا کی ذات کو تو صفر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی ذات بحیثیت خود کمالات سے عاری ہے۔

تو پھر یہ سوال پیدا ہو گا کہ ذات و صفات میں تلازم کیوں قائم ہے جب کہ وہ ایک الگ چیز ہے اور یہ الگ چیزیں ہیں ۔اور بحیثیت ذات ذات میں ان کمالات کی ضرورت نہیں ہے۔یہ سوال پیدا ہونا چاہیے کہ ذات میں یہ صفات کیوں قرار پائے۔اور تلازم کیوں ہوا یعنی خدا کی ذات جب سے ہے تب سے وہ عالم کیوں ہو؟ قادر کیوں ہو ؟قدیم کیوں ہو؟ اگر اپ نے کہا کہ خود ذات الٰہی چاہتی ہے اس بات کو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خود ذات بحیثیت ذات کمالات کی حامل ہے ۔

پھر ذات کے علاوہ کوئی اور چیز ماننے کی ضرورت نہیں پڑتی ۔اور اگر بحیثیت ذات تقاضا نہیں ہے اس بات کا کہ اشیاء کا انکشاف بھی ہو ۔چیزیں معلوم ہوں ۔تو کیا وجہ کہ اس کی ذات کے ساتھ علم بھی ہو۔ اور ذات کے ساتھ قدرت بھی ہو ۔پھر یہ عالم و قادر اور حی وغیرہ وغیرہ تمام صفتیں جب ذات سے جداگانہ ہیں تو یہ سوال پیدا ہو گا کہ کیا یہ صفات خدا کے مخلوق ہیں یا نہیں ۔

اگر کہیں کہ خدا کے مخلوق ہیں۔ یعنی خدا نے اپنے علم کو پیدا کیا ۔خدا نے اپنی حیات کو پیدا کیا ۔تو جب تک کہ خدا اپنے علم کو پیدا کرے وہ جاہل ہے جب تک کہ خدا اپنی حیات کو پیدا کرے وہ مردہ ہے ۔جب تک خدا اپنی قدرت کو پیدا کرے وہ بے اقتدار ہے ۔اور اگر یہ کہا جائے کہ خدا کے مخلوق نہیں ہیں یہ صفات۔اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مستقل قدیر واجب الوجود ہیں اور خدا سے بے

نیاز ہیں۔ تو ذات و صفات میں تفریق کیوں قرار پائی کہ ایک ذات اور آٹھ صفتیں۔ یہ غور کرنے کے قابل چیز ہے۔ عام طور سے ذات و صفات کی تعریف یوں قرار پاتی ہے کہ جو چیز محل ہو اور محتاج الیہ ہو وہ ذات ہے اور جو چیز اس کی طرف منسوب ہو اور محتاج ہو وہ صفت ہے ۔

لیکن جب کہ یہ صفات مستقل قدیم ہیں اور جس طرح ذات مستقل ہے اسی طرح وہ آٹھ بھی بے نیاز ہیں تو کون سی ترجیح پیدا ہوتی ہے کہ ان میں سے ایک کو ذات قرار دیا جائے اور آٹھ کو صفات۔ اور جب کہ ایک دوسرے کا محتاج نہیں ہے تو ان میں اجتماع کس لیے ہے ۔ترکیب و اجتماع باہمی احتیاج سے پیدا ہوتا ہے۔ورنہ ایک دوسرے سے اگر ارتباط و احتیاج نہ ہو تو کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ایک چیز دوسری چیز کے ساتھ مل کر پائی جائے ۔

جب خدا کی ذات یعنی خدا ۔مجموعہ ہے نو چیزوں کا جس میں ایک ذات ہے اور آٹھ صفات۔ اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے مستغنی اور بے نیاز ہے ۔تو ضرورت کیا پیدا ہوئی کہ یہ سب مل کر رہیں۔یہ عجیب بات ہے کہ آٹھوں بجائے خود قدیم ہیں لیکن جب علم و قدرت کو دیکھتے ہیں اور پھر بغیر حیات کے اس کا لحاظ کرتے ہیں تو کوئی مفہوم ہی نہیں قرار پاتا کیونکہ علم و قدرت بغیر حیات کوئی چیز ہی نہیں ہے۔

پھر ان سب کو ہم مستقل ایک دوسرے کے مقابل اور قدیم کیسے سمجھ لیں۔اور سنئے اگر یہ سب ایک دوسرے کے مقابل قدیم ہیں تو خالق کائنات ان سب کا مجموعہ ہے یا ان میں سے ایک یا کوئی بھی نہیں۔ یہ نو قدیم ایک دوسرے کے مد مقابل ازل سے ہیں تو خالق کائنات کون چیز ہے۔ اگر

خالق کائنات ذات خدا ہے تو علم و قدرت کو کوئی دخل اس میں نہیں ہے۔ اگر خالق علم و قدرت ہے تو ذات کو ماننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یعنی تنہا علم و قدرت ہی کافی ہے۔ یہ اتنے قدیم جو ہیں جب ایک کو دوسرے کی ضرورت ہی نہیں ہے تو ان سب کی حاجت کیا ہے۔ ان میں سے ایک ہی کافی ہے ۔غرض یہ ہے کہ یہ کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ درحقیقت خدا کی وحدت نہیں قائم رہ سکتی۔ اسی وجہ سے امیر المومنین علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ "مَنْ كَمَالِ الاِخْلَاصِ لَهُ هِيَ الصِفَاتُ عَنْهُ لِشَهَادَةِ كُلِّ مَوْصُوفٍ أَنَّهُ غَيْرُ الصِفَةِ وَشَهَادَةِ كُلِّ صِفَةٍ أَنَّهَا غَيْرُ الْمَوْصُوفِ فَمَنْ وَصَفَ اللَّهَ سُبْحَانَهُ فَقَدْ ثَنَّاهُ وَمَنْ ثَنَّاهُ فَقَدْ جَزَّأَهُ وَمَنْ جَزَّأَهُ فَقَدْ جَهِلَهُ وَمَنْ جَهِلَهُ فَقَدْ أَشَارَ إِلَيْهِ وَمَنْ أَشَارَ إِلَيْهِ فَقَدْ حَدَّهُ وَمَنْ حَدَّهُ فَقَدْ عَدَّهُ."

ترجمہ : "خدا کی خالص توحید کا تکملہ یہ ہے کہ صفات کی اس سے نفی کی جائے یعنی اس کو ذات ہی ذات مانے اس کے علاوہ صفت کا قائل نہ ہو۔اس کے متعلق فرماتے ہیں۔ کیونکہ ادھر تم نے صفت مانی تو پھر صفت کے مفہوم ہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ موصوف سے جدا ہو اور خود موصوف کے معنی کا لازمہ یہ ہے کہ وہ صفت سے کوئی الگ چیز ہے ۔تو جس نے اس کے لیے صفتیں قرار دیں اس نے اسے ایک سے زیادہ مان لیا ۔اور جس نے ایک سے زیادہ مان لیا اس نے اسے مرکب مان لیا اور جس نے اس کا تجزیہ کر لیا اس نے درحقیقت خدا کو خدا ہی نہیں سمجھا۔ اور اس کو نہ سمجھنے کی بنا پر اس نے قابل اشارہ حسیہ سمجھ لیا اور محدود بنا دیا اور اس طرح عام چیزوں کے شمار میں لے آیا "۔

☆☆☆☆☆

صفات ثبوتیہ

خدا سراسر ہستی ہے اس میں تمام صفات ثبوتیہ مضمر ہیں ۔کیونکہ ہستی ہر کمال کا مرکز ہے ۔اس کو الفاظ میں تشریح کیجئے تو مقام تعبیر میں مختلف چیزیں قرار پاتی ہیں۔ لیکن حقیقتاً وہ کچھ الگ الگ چیزیں نہیں ہیں اس میں جب نیستی کا گزر نہیں تو اسی سے ظاہر ہے کہ وہ قدیم ہے یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اسی کو ازلی اور ابدی کہتے ہیں اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ بھی اسی دنیا کا ایک جزو ہوگا اور اس کے واسطے بھی کسی پیدا کرنے والے کی ضرورت ہوگی۔ تو پھر وہ خالق کل نہ ہوگا ۔اس نے دنیا کو ارادہ و اختیار کے ساتھ پیدا کیا ہے اس لئے کہ اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق میں حکمتیں اور مصلحتیں مضمر ہیں اور ایک خاص انتظام نظر آتا ہے۔

اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا عالم و قادر ہے کیونکہ بغیر علم کے حکمت و مصلحت بنی پیدا نہیں ہو سکتی اور بغیر قدرت کے ارادہ و اختیار کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔اسی علم و قدرت کے لحاظ سے وہ حی یعنی زندہ ہے کیونکہ شعور و عمل یہی دو چیزیں زندگی کے خاص آثار ہیں ۔اس کے علاوہ اور کوئی معنی حیات کے خداوند عالم کے لئے ثابت نہیں کیے جا سکتے ۔مگر یہ علم و قدرت اور حیات جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا خدا کی ذات سے جداگانہ کوئی چیز نہیں ہیں ۔

خدا کو ہم عالم کہتے ہیں خدا کو قادر کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بات صفت علم سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ بدرجہ کمال اس کی ذات کو خود حاصل ہے ۔جو کچھ صفت قدرت سے پیدا ہوتا ہے وہ درجہ کمال خود اس کی ذات کے لیے ہے۔ جو کچھ حیات سے پیدا ہوتا ہے وہ بذات خود اس کی ذات کے

لیے حاصل ہے۔ مثلاً چیزوں کا منکشف ہونا ۔واقفیت کا حاصل ہونا۔یہ نتیجہ ہے علم کا ۔ہم میں یعنی ہماری ذات میں یہ بات صفت علم کے ضمیمہ سے پیدا ہوتی ہے ۔خدا کے یہاں اس ضمیر کی ضرورت نہیں خود اس کی ذات کے لئے وہ بات حاصل ہے اس کے ادا کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی لفظ نہیں ہے سوائے لفظ علم کے اس لیے ہم خدا کو کہتے ہیں عالم۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں ہے کہ اس کی ذات اور ہے ۔علم اور ہے۔ بلکہ علم کا جو نتیجہ ہے وہ اس کی ذات ہی میں حاصل ہے کائنات پر قابو ہونا یہ کس چیز کا نتیجہ ہے؟ قدرت کا ۔یہ خدا کو بذات خود حاصل ہے ۔اس لیے اس کو کہتے ہیں قادر ۔چونکہ نتیجہ قدرت کا اس کے لئے حاصل ہے مگر یہ نہیں ہے کہ اس کی ذات کے علاوہ کچھ ہو جس کو کہیں قدرت۔

عام علم کلام کی کتابوں میں جو خدا کے صفات درج کیے ہیں ۔عالم قادر ۔حی یعنی زندہ مرید کارہ ۔سمیع و بصیر ۔مدرک ۔متکلم آپ اگر ان صفات پر غور کیجئے تو سب جا کر جمع ہو جاتے ہیں علم و قدرت میں۔علم کے معنی کیا ہیں؟ تمام چیزوں پر کمال اطلاع حاصل ہونا قدرت کے معنی کیا ؟تمام چیزوں کا قابو میں ہونا ۔پھر یہ لفظیں ہیں جو ہم ادا کرتے ہیں۔ اس کی اصلیت کیا ہے؟ حقیقتاً قدرت و علم دونوں ایک طرح کے احاطے ہوتے ہیں۔ کسی شے کا تسلط اور تمام چیزوں کو گھیرے ہوئے ہونا ۔اسی کے ایک پہلو کا نام ہے علم اور ایک پہلو کا نام ہے قدرت۔

انسان کے لیے باطنی قورت یعنی ادراکات ہیں۔ ان ادراکات کے اعتبار سے جو کسی شے کو گھیرتا ہے اور احاطہ کرتا ہے یعنی وہ چیز سماتی ہے اس کے ادراکات میں۔ تو اس طرح کے احاطہ کو کہتے ہیں علم

اور وہ چیز جو انسان کے عمل کے حدود میں ہوتی ہے۔ اس کو کہتے ہیں قدرت۔ یعنی انسان میں دو جوہر ہیں الگ الگ ایک ادراک اور ایک عمل ادراک کے احاطہ میں ہونا علم ہے اور عمل کے احاطہ میں ہونا اس کا نام ہے قدرت۔

اب دیکھیئے خدا کی ذات کو جو عالم و قادر کہتے ہیں وہ کس بنا پر ہے۔ بات یہ ہے کہ جتنی کائنات ہے اس کی نسبت جو خدا کے لحاظ سے دیکھتے ہیں تو وہ خالق ہے ۔یہ مخلوق۔ وہ پیدا کرنے والا ہے۔ یہ پیدا ہونے والی ہیں ۔اس لحاظ سے وہ اس تمام کائنات سے مافوق ہے یعنی اس کی ہستی ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے۔بحیثیت مخلوق ہونے کے یہ تمام ہستیاں اس کی ہستی میں گھری ہوئی ہیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ خالق نہ ہو ۔

یہ چیزیں مخلوق نہ ہوں ۔اس کا سراسر ہستی ہونے کی بنا پر مرکز وجود ہونا اور اس کے ماسوا ہر وجود کا اس کی طرف محتاج ہونا اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کو ہر شے پر کامل احاطہ حاصل ہو اسی کامل احاطہ کا نام ہے علم اور دوسری حیثیت سے اسی کا نام ہے قدرت ۔اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی قدرت و علم کسی خاص چیز سے مخصوص نہیں ہے۔

کیونکہ تمام کائنات ہے ممکن اور وہ ہے واجب ۔تمام کائنات ہے حادث اور وہ ہے قدیم۔ اس لیے سب چیزوں کو یکسا نسبت اس کے ساتھ حاصل ہے ۔جب یکساں نسبت ہے تو اس میں تفریق نہیں قائم ہو سکتی کہ بعض چیزوں کو جانتا ہے اور بعض کو نہیں جانتا اور بعض پر قدرت رکھتا ہے اور بعض پر نہیں رکھتا ہے ۔اگر آپ عالم کائنات پر غور کیجئے تو اس دنیا کی ہر ہر چیز ۔اور ہر ہر ذرا چاہے وہ

چھوٹا ہو یا بڑا۔اسی نظام میں منسلک ہے جو نظام خلقت کا قرار دیا گیا ہے۔ اگر اس نظام سے کوئی چیز خارج ہوتی تو میں کہتا کہ خدا کو اس چیز کو جاننے کی ضرورت نہیں ہے لیکن جب کہ تمام چیزیں ایک نظام میں منسلک ہیں۔ تو اگر جانتا ہے تو سب کو اور نہیں جانتا تو کسی کو بھی نہیں جانتا۔اب چونکہ اس کا علم و قدرت ثابت ہو چکا تو اس کی عمومیت بھی اسی کے ساتھ ثابت ہے وہ عالم کل اور قادر مطلق ہے۔ کوئی شے اس کے احاطہ علم و قدرت سے خارج نہیں ہے ۔

یہ ہے صحیح عقیدہ الوہیت خدا کے متعلق جو مسلمانوں کے حق پرست فرقہ میں پایا جاتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ خدا کی ہستی اگر کوئی چیز ہے تو پھر وہ انہی صفات کی ہو سکتی ہے۔ یا تو مادین کے نقطہ نظر کے موافق وہ ہو ہی نہیں اور اس کا وجود تسلیم ہی نہ کیا جائے مگر میں نے ثابت کیا کہ یہ بالکل غلط ہے خدا کا وجود یقینی ہے تو پھر جب وہ ہی تو جسم ہرگز نہیں ہے۔

جسمانیات سے مبرا اور منزہ ہے ۔میں تو کہتا ہوں کہ بس انسان یا ادھر چلے جائیں یا ادھر چلا آئے۔یعنی عقلی حیثیت سے یا تو وہ ہے ہی نہیں یا اگر ہے تو پھر ایسا ہے جیسا مسلمانوں کا صحیح عقیدہ ہے درمیان میں کوئی منزل نہیں ہونا چاہیے۔خدا کی ہستی کو مان لینے کے بعد یہ کہ وہ حلول بھی کر سکتا ہے وہ چلتا پھرتا بھی ہے۔ ٹہلتا بھی ہے۔

وہ ایک جگہ متمکن بھی ہے اور محدود بھی۔ ہرگز خدا شناسی کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ ایسے خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ہم بھی ایسے خدا بنا سکتے ہیں اور اگر خدا کے نام سے محبت ہے تو ہر شخص اپنا نام خدا رکھ سکتا ہے لیکن ہمیں تو اس حقیقت کی تلاش ہے جو ان مادی حدود سے بلند

ہو۔ ورنہ مادتین بیچاروں کے جواہر فردہ اور سالمات کیا برے تھے ماننے کے لیے لیکن انہیں اس لیے مانا نہیں گیا کہ ان میں نقائص پائے جاتے ہیں۔تو اب اگر ہم نے خدا کو بھی ایسا مانا جو انہی نقائص سے گھرا ہوا ہو تو ہمیں حاصل ہی کیا ہو۔ اگر خدا کو آپ مانتے ہیں تو اس کو بلند مانئیے عام مادی چیزوں سے آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی بادشاہ ہے وہ تخت پر بیٹھا ہے تو اب خدا چونکہ مالک الملک ہے تو وہ بھی تخت پر ضرور بیٹھے۔

پھر بہتر یہ ہے کہ انہی بادشاہوں میں جو سب سے بڑا بادشاہ ہے اسی کو خدا مان لیجئے اور آپ کے حد تصور میں جو بڑے سے بڑا تخت ہو وہ اس کے لیے بنوا دیجیے۔عقل ہرگز اس کو قبول نہیں کر سکتی۔جس طرح عیسائیوں کا عقیدہ کہ خدا نے بحیثیت باپ کے عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا اور عیسیٰ کے ساتھ متحد ہو گیا اس طرح کے روح القدس عیسیٰ اور خدا سب ایک ۔پھر لطف یہ ہے کہ وہ خدا اپنے اس مجسمہ کے ساتھ جو عیسیٰ کی شکل میں تھا سولی پر بھی چڑھ جاتا ہے اس طرح کم سے کم ایک تہائی خدا تو گھٹ گیا۔

جب سولی دے دی گئی۔ اس لئے کہ تین سے مرکب تھا روح القدس تھا۔بیٹا تھا۔باپ تھا۔جس وقت بیٹا اپنی امت پر فدا ہو گیا تو کم سے کم الوہیت کی تپائی کا ایک پایا ٹوٹ گیا اب دو پیروں پر اگر خدائی کھڑی رہ سکے تو کھڑی رہے۔اسی طرح مجوسیوں کا عقیدہ کہ خدا ہے اور ایک اور ہستی خدا کے مد مقابل ہے وہ اس کے ساتھ ہے۔ خدا اچھائیوں کو پیدا کرتا ہے۔ اور وہ ہستی برائیوں کو پیدا کرتی ہے ۔تو جب برائیوں کی پیدا کرنے والی وہ ہستی ہے تو پھر بھی قابل تعظیم ہے اس لئے کہ وہ بھی خدا ہے یعنی یزدان و اہرمن کا عقیدہ جسے ایران کے قدیم لوگ مانتے تھے۔

یہ انسان کی کوتاہ نظری ہے مادہ کے ساتھ انسان کو محبت ہے اگر وہ عقلی دلائل سے مجبور ہو کر خدا کو مانتا بھی ہے تو اس سے جامع پہنا دیتا ہے ۔مادہ کا اسی کا نتیجہ ہے خدا کے ماننے کے بعد اس کے لئے جسمانی مظاہر کی تلاش کرتا ہے کہ وہ جسم کے اندر ہو کر نمایاں ہو اب جس وقت کے ایک جسم کے اندر وہ محدود ہے تو تمام عالم کائنات خدا سے خالی ہو جائے گا پھر جب عالم کائنات خدا سے خالی رہ سکتا ہے تو خدا کی ضرورت ہی نہ رہی درحقیقت یہ ایسی چیزیں ہیں جو عقلی معیار بحث ہی پر نہیں آتیں۔کہ کوئی سنجیدہ گفتگو کی جائے۔

☆☆☆☆☆

توحید اسلامی

عقلی اور اصولی بحث تو بس خدا کے وجود وعدم پر ہو سکتی ہے وہاں تک تو عقل کو سوچنے کا محل پیدا ہو سکتا ہے اس کے بعد کوئی سنجیدہ بحث کا محل باقی ہی نہیں رہتا جیسے توحید کا مسئلہ جس بنا پر خدا کے وجود کو ہم نے سمجھا وہ ضرورت ایک کو ماننے سے پوری ہو گئی تو یہ دو کدھر سے آ گئے ۔

یعنی ان دلائل کا تقاضا جو خدا کے وجود کو ماننے کے متعلق ہیں یہ ہے کہ خدا کے بغیر نظام عالم برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔جب ایک کے ہونے سے کام چلنے لگا تو وہ دوسرا کیا ہو گا ؟خالی بیٹھا رہے گا؟ اس کے لیے کوئی کام نہیں ہے۔ تو وہ معطل ہو گا اور معطل چیز کبھی برقرار نہیں رہ سکتی ۔اب اگر کچھ کرے گا تو وہ کیا ہو گا۔جب یہ کام کر رہا ہے تو اس کا کام صرف تخریب ہی رہ جائے گا روڑے اٹکانا اس کا کام ہو گا ۔اسی لئے قرآن مجید میں کہا گیا ہے" لَوۡ كَانَ فِيۡهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا "۔

ترجمہ: " اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا معبود ہوتے تو دونوں (کے نظام) درہم برہم ہو جاتے"۔ (سورہ الانبیاء :22)۔اس لئے کہ ایک مصروف انتظام ہے دوسرا جو کام کرے گا تو وہ بس اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے تو خدا نہ رہا۔کیونکہ یہ تو خدائی ہے یہ کوئی آپ کے جلسے تو ہیں نہیں کہ اس میں محرکوں اور مریدوں کی ضرورت ہو ۔اب اگر وہ بھی ارادہ کرتا ہے اور وہ اس کے موافق ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں اور اگر اس کے خلاف ہے اس کا ارادہ تو دونوں ناکام ہوں گے ۔یا ایک کامیاب ہوگا دوسرا ناکام ہوگا ۔

اگر دونوں ناکام رہے تو دونوں خدا نہ رہے ۔اور اگر ایک ناکام رہا تو وہ خدائی سے معزول۔معلوم ہوا کہ خدا کو ماننے کے بعد ایک سے زائد ماننا کوئی عقلی بنیاد اس کے لیے ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی طرح خدا کو ماننے کے بعد اس کو چیز و مکان کا محتاج ماننا۔ یہ وہ خدا ہی نہیں جیسے عقل نے کہا تھا کہ ضرور ہے۔ خدا کے ماننے کے بعد اس کو یہ کہنا کہ وہ دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ تو حقیقت خدا کا جسم بھی مان لینا ہے اور محدود بھی مان لینا ہے اس کے بعد کوئی معنی نہیں ہوتے اس کے کہ جسم نہیں ہے۔ اور اگر جسم نہیں ہے تو اس کو دیکھنے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔پھر میں یہی کہوں گا کہ آپ کے نزدیک اگر خدا ہے تو آکر ٹھہریے اسی نقطہ تک جسے ہم مانتے ہیں اور اگر نہیں ہے تو کہیئے کہ کچھ نہیں ہے یا اس کے بعد درمیان میں آکر ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اسی بنا پر قرآن مجید میں آیا ہے۔ "وَ مَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ ۚ وَ ہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ" ۔ ترجمہ:"اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا خواہاں ہو گا وہ اس سے ہرگز

قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گا" (سورہ آل عمران :85)۔یعنی عقلاً یا تو لادینی ہے یا دین ہے تو اسلام اور حقیقتاً وہ مذہب فطرت جس میں خدا شناسی کی صحیح تعلیم دی گئی ہو وہ اسلام ہی کا مذہب حق ہے جسے سچے رہنمایان اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ مادیت ہے جس کو خدا پرستی کا لباس پہنایا گیا ہے۔ صرف الفاظ ہیں جن میں خدا کا اقرار ہے لیکن حقیقتاً اس سے انکار ہے۔دنیا کو چاہیے کہ وہ عقل سے کام لے اور خدا شناسی کی منزل میں اسلام کے رہنمایان حقیقی کے تعلیمات کو اپنا دلیل راہ بنائے تو منزل حقیقت سے دوچار ہو گی اور خدا کی سچی معرفت کے درجات تک پہنچ سکے گی۔

☆☆☆☆☆

خدا پرستی اور مادیت کی جنگ

آج کل اکثر حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ مادیت دنیا میں ترقی کر رہی ہے اور ایمان باللہ کا عقیدہ بہت کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے ایک طرف تو پرستاران مادہ کا لاہ فخر آسمان پر اچھالتے ہیں اور یہ امید ظاہر کرتے ہیں کہ ایک وقت میں دنیا سے مذہب بالکل مٹ جائے گا۔ دوسری طرف اہل مذہب پر مایوسی چھائی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اب ہم انتہائی کمزور ہو گئے ہیں۔

مگر کیا یہ خیال صحیح ہے میں تو سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے دنیا میں خدا پرستی اور مادیت کی جنگ ہمیشہ سے جاری ہے اور انسان چونکہ خود مادی خواہشوں میں اور مادیات کے شکنجہ میں اسیر ہے اس لیے

اکثر افراد ہمیشہ سے خدا کے منکر رہے ہیں اور وہ افراد بہت کم رہے جو خدا کو واقعی مانتے ہوں لیکن یہ لوگ اپنے عزم وارادہ اور قوت ایمان و اعتقاد سے ہمیشہ اس جنگ میں کامیاب ہوتے رہے اور مادیت کو شکست ہوتی رہی۔

ہمارا لامذہبیت کے بڑھنے کا انتہائی شکوہ کرنا ویسا ہے جیسے ہر زمانہ کا شخص اپنے زمانہ کی گرفتاری کا اور ہر عالم اپنے زمانہ میں نا قدری علم کا مرثیہ پڑھتا رہا ہے ۔اگر آپ ہر دور کے مصنفین کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھئیے تو اس میں اپنے زمانہ کا اس طرح دردناک الفاظ میں تذکرہ ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس حالت سے بدتر حالت آ ہی نہیں سکتی ہم ان الفاظ کے لحاظ سے اگر رفتار تنزل کی بناء پر اپنے زمانہ کا قیاس کریں تو چاہیے کہ ہمارے وقت میں ایک نقطہ بھی اچھائی کا باقی نہ رہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف نتیجہ ہے اس بات کا کہ انسان کو اپنے سامنے کے واقعات سے تکلیف زیادہ پہنچتی ہے اور وہ اس کی قدر زیادہ کرتا ہے اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بدتر حالت کبھی نہ آئے گی ۔حالانکہ حقیقتاً حالات تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ اور ان میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا ۔میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کس زمانہ میں یہ مادیت نہیں تھی عقائد میں مادہ رہا۔ افعال میں رہا۔عقیدہ میں خدا کا نام زبان پر لیکن۔

خود کوزہ ؤ خود کوزہ گر وخود گل کوزہ   خود برسر بازار خریدار برآمد

کیا اس کے معنی خدا کو بھی مادی ذرات بنا لینا نہیں ہے وہی مادہ تھا جس نے بتوں کے سامنے سر جھکوا دیے اسی مادہ کے ساتھ تعلق کا قائم ہونا ان چیزوں کے ساتھ ذہن کا مانوس ہونا کوئی فلسفی حکیم ہے

اس نے نظریات کے ذریعہ سے ظاہر کیا۔کوئی سطحی نظر والا ہے اس نے افعال سے ظاہر کیا ہر محبوب شے کو دیکھ کر اس کے سامنے جھک گئے ہر بڑی چیز کو دیکھ کر اپنے سے بلند سمجھنے لگے آفتاب کی پرستش کی گئی مہتاب کی عبادت ہوئی ستاروں کو معبود مانا اس کے مقابلہ میں دلیل بھی وہی پیش کی گئی جو مادیت کے ابطال کا ذریعہ ہے یعنی یہ کہ متغیر چیز خدا نہیں ہو سکتی ملاحظہ ہو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بحث جس کا قرآن میں تذکرہ ہے۔

"فَلَمَّا جَنَّ عَلَيۡهِ الَّيۡلُ رَاٰ كَوۡكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّىۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِيۡنَ"۔

ترجمہ ۔ "چنانچہ جب ابراہیم پر رات کی تاریکی چھائی تو ایک ستارہ دیکھا، کہنے لگے :یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ غروب ہو گیا تو کہنے لگے :میں غروب ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔

(سورہ الانعام : 76)۔

اسی طرح چاند اور سورج دونوں کی ربوبیت کو ایک ایک کر کے باطل کیا اور اس کے بعد کہا۔

"اِنِّىۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِىَ لِلَّذِىۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ حَنِيۡفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ"۔

ترجمہ۔"میں نے تو اپنا رخ پوری یکسوئی سے اس ذات کی طرف کیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں"۔(سورہ الانعام : 79)۔

یہ مادیت تھی جس کے پیش نظر مقدس کتابوں میں ایسی باتیں شامل کر دی گئیں جو ہرگز جلال الہٰی کے لیے مناسب نہیں ہے جیسے تورات میں حضرت آدم کے قصہ میں جس وقت انہوں نے گیہوں کھایا۔تمام جسم عریاں ہو گیا لکھا ہے کہ آدم کو خدا ٹہلتا ہوا اس باغ کے اندر دکھائی دیا۔وہ سیر و

تفریح کے لیے باغ میں آیا تھا آدم کو فطرتاً شرمندگی محسوس ہوئی درخت کے اندر چھپ گئے ۔خدا نے آواز دی تم کہاں ہو آدم نے کہا میں درخت کی جھاڑی میں چھپا ہوا ہوں یہ کس نے خدا کا اس طرح کا تصور پیش کرایا ہے یہ وہی مادیت کے ساتھ انسان کی محبت ہے۔

اسی طرح یہ کہ حضرت یعقوب سے رات بھر خدا نے کشتی لڑی۔ حضرت یعقوب بھی ایسے تھے کہ رات بھر لڑا کے اور کوئی مغلوب نہ ہوا ۔جب صبح قریب ہوئی تو خدا نے کہا بس مجھے اب چھوڑ دے۔ یعقوب نے کہا میں تو نہ جانے دوں گا مجھے برکت دے جا اسی بناء پر لقب ہوا اسرائیل ایل کے معنی عبرانی میں ہیں خدا کے اور اسرا کے معنی ہیں قوت کے یہ مادیت ہی کہ جذبات تھے جنہوں نے خدا کے لیے حلول کی اجازت دی کہ خدا مختلف جسموں میں حلول کرتا ہے۔ نمایاں ہوتا ہے درختوں میں نمایاں ہوتا ہے ۔جس میں کبھی اس نے زیارت کرا دی وہ ہمیشہ کے لیے مقدس ہو گیا اس کے لیے کسی نے کہا۔

نیست اندر جائمہ ام غیر از خدا　　　لا الہ الا انا ہا فا عبدون

"میرے ان کپڑوں میں خدا کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔آؤ سب میری عبادت کرو"۔

یہ کیا ہے وہی خدا کی ہستی کو اس کے تنزیہ و تقدیس کے درجہ سے گرانا اور نقائص سے متصف کرنا ان تمام عقائد میں مادہ کی کار فرمائی تھی اسی طرح افعال و اعمال سے دنیا میں ہمیشہ خدا کے انکار کا مظاہرہ ہوتا رہا ہمیشہ دنیا اپنے افعال سے یہ ثابت کرتی رہی کہ وہ خدا کی قائل نہیں ہے وہ فرعون کی فرعونیت خدا سے انکار ہی پر مبنی تھی اس کا یہ کہنا" يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ"۔

ترجمہ۔" اے ہامان !میرے لیے ایک بلند عمارت بناؤ"۔ (سورہ غافر : 36)۔

"اَطَّلِعُ اِلٰٓی اِلٰہِ مُوۡسٰی ۙ وَ اِنِّیۡ لَاَظُنُّہٗ مِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ"۔

ترجمہ ۔"تاکہ میں موسیٰ کے خدا کو (جھانک کر) دیکھوں اور میرا تو خیال ہے کہ موسیٰ جھوٹا ہے"۔ (سورہ القصص : 38)۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہی تصور سامنے ہے کہ خدا اگر ہے تو بلندی پر بیٹھا ہوا ہوگا۔ اور قلعہ پر سے دکھائی دے گا ۔اس کے بعد خدا کے نہ ماننے ہی کا نتیجہ تھا کہ دنیا کو نہ ماننے کی دعوت دے رہا ہے یہ کہہ کر" أَنِي لَا أَعْلَمُ لَكُمْ مِنَ إِلَهٍ غَيْرِي"۔ترجمہ :"میں تمہارے لیے کوئی خدا نہیں جانتا ہوں سوائے اپنے"۔یہ درحقیقت اس کے خیالات تھے جو زبان سے نکلتے تھے۔ یہ اس کی جرأت تھی کہ اس نے اعلان کر دیا۔

ورنہ دنیا میں ہر زمانہ کے فرعون اپنے اعمال سے ثابت کرتے رہے ہیں کہ وہ اپنے تئیں خود معبود سمجھتے ہیں ۔اور دنیا والے ہمیشہ اپنے اعمال سے اس بات پر مہر کرتے رہے ہیں کہ بس آپ ہی آپ ہیں اور کوئی بھی نہیں۔یہی جذبہ جب حد سے بڑھا اور اندیشہ نہیں باقی رہا تو زبان سے ظاہر ہو گیا۔اگر زبان سے اظہار میں اندیشہ ہوا تو عمل سے ظاہر ہوا۔

اس کے خلاف خدا کے وجود کے بارے میں گواہی ہر زمانہ میں خدا کے بندے دیتے رہے اور اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ دنیا کی تمام طاقتیں ہیچ ہیں اس کے مقابلہ میں اور صرف ایک ہستی ہے جو ان سب سے بالاتر ہے۔آج دنیا کہتی ہے کہ آنکھوں سے جو چیز نہیں دیکھی گئی ہو اس کا یقین کیسے

ہو سکتا ہے ۔میں سچ کہتا ہوں کہ آنکھوں سے نہ دیکھنے کی بنا پر وہ یقین ہوتا ہے جو دیکھنے کی بنا پر نہیں ہو سکتا ۔آنکھوں سے دیکھنے کی تمام چیزیں انسان کو روک رہی ہیں کسی اقدام سے اور کوئی ایک غیبی طاقت ہے وہ محرک ہے انسان تمام مادی چیزوں سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اور اس غیبی طاقت کے اشارہ پر کام کرتا ہے۔وہ فرعون کا دربار اور وہ آثار سلطنت۔

وہ تمام شان و شوکت اور وہ جاہ و جلال۔ اس میں موسیٰ و ہارون دو خدا کے بندے اور وہ ایسی آزادی سے پیغام پہنچا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام چیزیں شان و شوکت کی کچھ بھی نہیں ہے ۔معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطنت جس کو آنکھیں دیکھ رہی ہیں وہ کوئی اثر نہیں ڈال رہی ہے مگر وہ طاقت جو دکھائی نہیں دیتی ہے اس کا احساس گھیرے ہوئے ہے ۔وہ نمرود کا دربار ۔اس میں ابراہیم ۔ابراہیم اکیلے نہ کوئی مونس نہ یاور اگر اس آنکھ سے دیکھی ہوئی طاقت سے مرعوب ہوتے جس کا نام تھا نمرود اور غیبی طاقت پر اعتقاد نہ رکھتے ہوتے تو کیا یہ استقلال پیدا ہوتا؟

مگر نہیں وہ تخت سلطنت پر کہہ رہا ہے کہ درحقیقت جو کچھ بھی اقتدار ہے وہ مجھ کو حاصل ہے اور ابراہیم سے کہتا ہے کہ خدا کے وجود کا کیا ثبوت ہے ابراہیم کہتے ہیں" رَبِّیَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ "۔ترجمہ : "میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے"۔ (سورہ البقرۃ : 258)۔

ابراہیم کہتے ہیں۔ "اِنَّ اللّٰہَ یَاۡتِیۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِہَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ"۔ " اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے،تو اسے مغرب سے نکال کر دیکھا "۔(سورہ البقرۃ : 258)۔

"فَبُہِتَ الَّذِیۡ کَفَرَ "۔ ترجمہ: "یہ سن کر وہ کافر مبہوت رہ گیا" ۔ (سورہ البقرۃ : 258)۔

یہ مقابلہ آلیہات کا اور مادیات کا دنیا میں ہمیشہ قائم رہا ہے ادھر دنیا والے اپنے عمل سے ثابت کرتے رہے اور اعلان کرتے رہے کہ خدا کچھ نہیں۔ ادھر خدا کے ماننے والے اپنے عمل سے ثابت کرتے رہے کہ یہ دنیا کچھ نہیں اور جو کچھ ہے وہ وہی ہے وہ مادیت تھی جو یحییٰ کے سر پر تلوار چلا رہی تھی اور وہ آلہیت تھی جو یہ سمجھنے کے بعد کہ میرا قتل یقینی ہے اپنا سر پیش کرا رہی تھی ۔

یہ بھلا ایک موہوم چیز انسان پر اثر ڈال سکتی ہے کیا ایک وہمی چیز انسان کی طاقت و جبروت کے مقابلہ میں قائم و برقرار رکھتی ہے؟ یہ وہی ہے جو میں کہہ رہا تھا کہ خدا کے ماننے والے خدا کو ہزار حقیقتوں سے زیادہ یقینی چیز سمجھتے ہیں ۔جو شک پر گمان پر وہم پر نہیں قائم ہے ۔بے شک انکار خدا کا سرمایہ لاعلمی ہے مگر خدا کا اقرار علم و یقین پر مبنی ہے وہ خدا کا انکار تھا مادیت ہی کے نقطہ نظر سے جو ولید بن یزید بن عبدالملک کی زبان سے کہلوا رہا تھا۔

" فَقُلِ اللَّهُ يَمْنَعُ طَعَامِي فَقُلِ اللَّهُ يَمْنَعُ شَرَابِي"۔ یعنی" کہو خدا سے میرا کھانا پینا بند کر دے میں تو شراب خوری ہی میں زندگی گزار دوں گا"۔ اور قرآن مجید میں جو فال دیکھی اور یہ آیت نکلی" وَ اسْتَفْتَحُوا وَ خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ" ۔ترجمہ :"اور انبیاء نے فتح و نصرت مانگی تو ہر سرکش دشمن نامراد ہو کر رہ گیا"۔(سورہ ابراہیم : 15)۔ تو قرآن کو پھاڑ ڈالا اور یہ شعر پڑھے۔

اتوعد کل جبار عنید فها انا ذاک جبار عنید
اذاماجئت ربک یوم حشر فقل یا ربّ مزقنی الولید

"کیا تو ہر سرکش اور معاند کو دھمکیاں ہی دیتا ہے ۔اچھا تو دیکھ کے میں سرکش اور معاند ہوں۔ جب تو اپنے خدا کے پاس قیامت کے دن جانا تو کہہ دینا کہ مجھے ولید نے پھاڑ ڈالا تھا"۔

یہ ہے انکار خدا کا مظاہرہ ۔یہی وہ انکار خدا تھا جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں دنیا والوں کی زبان سے یہ کہلواتا تھا کہ جتنی دولت لینا ہو لے لیجئے اور جس بڑے سے بڑے عرب خاندان میں آپ کہیں شادی کر دیں ۔مگر آپ پیغام توحید نہ پہنچائے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ سمجھتے تھے وہ دنیوی چیزوں کو سمجھتے تھے اس کے علاوہ اور کچھ نہ جانتے تھے۔ مگر یہ خدائی غیبی طاقت تھی جس نے کہلوا دیا رسول کی زبان سے کہ اگر میرے ایک ہاتھ پر آفتاب رکھ دو اور ایک پر مہتاب۔ اور مجھ سے یہ توقع رکھو کہ میں اپنے الٰہی پیغام سے باز آ جاؤں تو یہ نہیں ہو سکتا ۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کچھ بھی نہیں اور وہ جس سے دیکھا نہیں وہی سب کچھ ہے۔یہ کیا تھا ڈھیلے پھینکے جاتے ہیں ۔پتھر پھینکے جاتے ہیں ۔خون بہنے لگتا ہے۔ ذلت کی جاتی ہے۔ خود ارشاد ہوتا ہے ۔" ما أُوذِيَ النَبِيُّ قَطٌّ كَمَا أُوذِيت"۔ترجمہ: "کسی نبی کو اتنی تکلیفیں نہیں پہنچیں مستقل تکلیفیں"۔ ایک انسان کی لیے قتل کیا جانا آسان ہے۔ مگر اس طرح کی قلبی تکلیفیں سخت ہوتی ہیں ۔پھر ملاحظہ ہو کے وہ مادیت ہی تھی جو عمر سعد کی طرف سے لوگوں کو گواہ بنا رہی تھی ۔گواہ رہنا کہ یہ پہلا تیر ہے جو میں حسین علیہ السلام کے لشکر پر لگاتا ہوں۔

اور وہ خدا کا پورا عقیدہ تھا جو حسین علیہ السلام سے کہلوا رہا تھا۔"اللهُمْ أَشْهَدُ عَلَى هؤلاءِ الْقَوْم" ترجمہ :"خداوند اس قوم پر گواہ رہنا"۔ عمر سعد صرف اس سامنے کی جماعت کو سب کچھ سمجھتا تھا اس لیے اس نے گواہی کے لیے ان کو پکارا ۔مگر وہ خدا کا ماننے والا کسی ایک غیبی طاقت کو حاضر سمجھتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنا گواہ اسے قرار دیا ۔گواہیاں دونوں کام آئیں گی۔ مگر وہ دنیا میں کام آئیں گی

جو فانی ہے اور یہ آخرت میں کام آئیں گی جو باقی ہے۔ وہ خدا کا انکار تھا جو بھرے ہوئے دربار میں حاکم شام کی زبان سے کہلوا رہا تھا۔

أين أشياخي ببدر شهدوا جزع الخزرج من واقع إلا همل

ترجمہ۔ "کہاں ہیں ہمارے وہ بزرگ جو جنگ بدر میں مارے گئے وہ آج دیکھتے کہ کس طرح ہم نے نیزہ بازی وشمشیر زنی میں کار نمایاں انجام دیئے "۔

لعبت هاشم بالملک ولا خرجا ولا وحی نزل

ترجمہ": یہ تو بنی ہاشم نے سلطنت کا ایک کھیل کھیلا تھا حالانکہ شکوئی خبر آئی تھی اور نہ کوئی وحی اتری تھی"۔

لَسْتُ مِنْ خِنْدِفٍ أَنْ لَمْ أَنْتَقِمْ مِنْ بَنِيْ أَحْمَدٍ مَا كَانَ فِعْل

ترجمہ ۔ "میں اپنے باپ دادا کی اولاد سے نہیں اگر احمد کی اولاد سے بدلہ نہ لوں اس کا جو انہوں نے بدر و احد میں کیا تھا"۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کوئی چیز نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ دنیا ہے جو کچھ ہے وہ اسی دنیا کا اقتدار ہے ۔اس کے بعد جو کچھ بھی اعمال و افعال کا محرک ہے وہ وہی حیوانیت۔ انتقام ،حوس طمع ،لالچ ان ہی سب کے ماتحت سب کام کیے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی چیز ہے ہی نہیں جو محرک کے عمل ہو۔لیکن وہ کہ جو خدا کے ماننے والے تھے انہوں نے دکھلا دیا کہ سلطنت کوئی چیز نہیں ۔حکومت کوئی چیز نہیں اقتدار کوئی چیز نہیں۔ اعضا کی محبت کوئی چیز نہیں۔ اولاد کوئی چیز نہیں۔ عزت کوئی چیز

نہیں۔ آبرو کوئی چیز نہیں ۔جو کچھ ہے وہ وہی ہے جو سب کا خالق ہے۔ جو سب کا پیدا کرنے والا ہے۔آج مادی دنیا کو آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہیں کہ کس کا نقطہ نظر صحیح تھا اور کس کا غلط ۔یعنی وہ مادی قصر جو سلطنت کی چوٹیوں پر قائم کیے گئے تھے ۔جو حکومت کی بنیاد پر قائم کیے گئے تھے ۔وہ سلطنتی اقتدار جو دنیا کے بھروسے پر قائم تھا۔ وہ دنیا میں کتنا طاقتور رہا اور کتنے دن اس کو بقا رہی۔ اور وہ خیال جو مادی نقطہ نظر سے لاشے پر مبنی تھا۔

اسے دنیا میں کتنا ثبات و استقلال حاصل ہوا۔آج وہ قصر ملیا میٹ ہو گئے ۔لیکن وہ خدائی کا سر دنیا میں اس طرح نمایاں ہوا کہ اقوام عالم اس کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کی عظمت کا احساس کرتے ہیں۔ اور یہی خاص پہلو ہے واقعہ کربلا کا ۔جس کی بنا پر میں کہتا ہوں اور یہ کوئی فرقہ وارانہ سوال نہیں ہے کہ ازل سے لے کر اس وقت تک مذہبیت اور مادیت آلہیت اور دنیا داری کے درمیان ایسی جنگ کبھی نہیں ہوئی تھی اور مذہب کو اتنی بڑی فتح دنیا کی طاقتوں کے مقابلہ میں کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی جتنی بڑی فتح واقعہ کربلا میں حاصل ہوئی۔اس لیے دنیا کے جتنے اہل مذہب ہیں خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں ۔

ان کو مذہبی احساس کی قوت دکھلا دینے کے لیے واقعہ کربلا کی یادگار قائم کرنا چاہیے ۔میں سچ کہتا ہوں کہ مادیت کے مقابلے میں عملی کامیابی جیسی کربلا میں حاصل ہوئی۔ اس کی مثال دنیا کے پردہ پر ناپید ہے ۔اگر یہ دنیا ہی کوئی چیز ہے۔اور اس کی مادی طاقتیں ہی سب کچھ ہیں ۔تو کیا حسین علیہ السلام کے مٹانے میں کوئی کسر بھی رہ گئی تھی؟ اور کیا یزید کی فتح و ظفر میں کوئی کمزوری سمجھی جا سکتی تھی ؟مکمل کامیابی! مگر وہ آنکھوں سے نہ دیکھی ہوئی طاقت ہے جس نے فنا کو بقا بنا دیا موت کو حیات

بنا دیا۔ وہی جو مٹ گیا تھا ہمیشہ کے لیے باقی رہا اور وہ کہ جو کامیاب ہوا تھا ہمیشہ کے لیے فنا ہو گیا۔ وہ جن کو فتح حاصل ہوئی تھی آج ان کی طرف نسبت رکھنے والے شرماتے ہیں۔

منسوب ہونے سے۔ اور وہ جو مٹا دیے گئے تھے ۔جن کا نام لینا جرم تھا ۔آج ان کی طرف غلط نسبت دینا بھی فخر سمجھا جاتا ہے جا کر دیکھ لیجئے دمشق کی قصر حکومت کو اور تاجدار دمشق کی آخری خواب گاہ کو یہ کیا ہے کوئی زبان سے خواہ کسی مسلک سے ان لوگوں کو اچھا کہے لیکن وہاں جا کر خود ضمیر اجازت نہیں دیتا رخ کرنے کی ۔متوجہ ہونے کی لیکن وہ کہ جسے دنیا نے مٹا دیا تھا ۔اور اس کے ساتھ ان حقوق کو بھی نظر انداز کر دیا تھا جو ہر مسلمان کو ہر مسلمان پر حاصل ہیں جا کر ذرا دیکھ لیجئے اس نے جنگل کو کاشانہ بنا دیا۔

سنسان میدان اور ریتلی زمین میں جو آج دنیا کا قبلہ مقصود بنی ہوئی ہے۔ شاہان دنیا کے سرخم ہونے میں اور سلاطین عالم کے دل متوجہ ہوتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں یہ ہمیشہ کے لیے مادیت اور روحانیت کی جنگ کا ایک فیصلہ ہے جو آپ کے سامنے ہے اور آپ کی آنکھوں کے سامنے محفوظ ہے اور آپ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ مادیت میں کتنی طاقت ہے اور روحانیت میں کتنی قوت ہے۔

☆☆☆☆☆

معرفت خدا کا عملی نتیجہ

یہ سمجھ لینے کے بعد کہ خدا کا وجود ہے۔ اور یہ اقرار کرنے کے ساتھ کہ ہمارا خالق اور ہمارا پیدا کرنے والا غیر ذی شعور مادہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک صاحب ارادہ ؤ اختیار ہستی ہے جو علم و اطلاع بھی

رکھتا ہے حاضر و ناظر بھی ہے ۔ان سب کو سمجھنے کے بعد ہم کو کیسا انسان ہونا چاہیے؟ یعنی وہ لوگ کہ جو خدا کو سمجھتے ہی نہیں منکر ہیں اس کے وجود کے۔وہ جو کچھ بھی کریں آپ کو ان سے کسی مطالبہ کا حق حاصل نہیں ہے ۔اس لیے کہ ان کے لیے حکمراں۔

ان کے افعال میں پابندی عائد کرنے والا سوائے ان کی طبیعت اور خواہش کے کہ کوئی چیز نہیں ہے۔ تو اب جو کچھ بھی وہ طریقہ کار اپنے لیے اختیار کر لیں ۔آپ کو کوئی اعتراض کا حق حاصل نہیں ہے ۔لیکن ہمیں یہ سمجھ لینے کے بعد کہ ایسا نہیں ہے بلکہ ہمارے اوپر کوئی ہستی ہے جو ہمارے افعال کی نگراں ہے۔اس کے بعد ہم کو اپنے افعال و اعمال میں کن صورتوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ اور کیا ہمیں بھی وہی مطلق العنانی زیبا ہے جو دوسروں کو ہے یا اعتقاد کا اثر ہمارے عمل میں نمایاں ہونا چاہیے ۔یاد رکھئے اگر یہ نہیں ہے تو اعتقاد بیکار ہے۔

کیونکہ جیسا کہ ہم میں نے پہلے کہا اعضاء وَ جوارح دل کے تابع ہیں۔اگر افعال تصدیق نہیں کرتے ہیں تو سمجھنا چاہیے کہ اعتقاد رسمی حیثیت سے ہے۔ دماغ میں ایک توہم اور تخیل کی طرح جگہ کیے ہوئے ہے ۔لیکن اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ پھر کیا یہ واقعہ ہے کہ ہر خدا کا نام لینے والا اپنے عمل سے بھی ثابت کرتا ہے کہ وہ خدا کو مانتا ہے۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر آپ غور کیجئے ان افعال و اعمال پر جو مذہب کے نام لینے والوں سے سرزد ہوتے ہیں تو یہ معلوم ہو گا کہ خدا کا نام تو ہے زبان پر مگر دل میں اس کا کوئی تصور نہیں ہے ۔یہ اہل مذہب کا طرز عمل ہی ہے جس نے مادئیین کو یہ کہنے کا موقع دے دیا کہ اہل مذہب کا طرز عمل

ہم کو مذہب سے متنفر بناتا ہے۔ بہرحال مخالف کی زبان سے نکلی ہوئی بات بھی اگر سچ ہے تو قبول کرنا چاہیے یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں اہل مذہب نے اپنے طرز عمل سے مذہب کو ایسی صورت پر بدنام کیا ہے کہ جس کے بعد مذہب کی حقانیت ہزار پردوں میں مخفی ہو گئی ہے۔ کون سی وہ سیاہ کاری تھی جو مذہب کے نام پر نہیں کی گئی ہے اور کون سی وہ خدا کی معصیت تھی جو خدا کے نام کا پردہ ڈال کر عمل میں نہ لائی گئی ہو۔

ہم زبان سے اگر خدا کا نام لیتے ہوں اور خدا کا اقرار کرتے ہوں۔ اور دلائل سے اس کو ثابت بھی کر دیں مگر ہم اپنے اعمال سے اس کے خلاف کرتے ہوں تو ہمیں کیا حق ہے کہ ہم دوسروں کو اس کے ماننے کی دعوت دیں۔خدا کے اقرار کا نتیجہ ہونا چاہیے کہ انسان کے افعال میں انضباط پیدا ہو۔ یعنی جتنے زندگی کے شعبے ہیں ان پر اثر پڑے۔ بہت چیزیں وہ ہیں جو خدا سے براہ راست متعلق ہیں یعنی وہ جنہیں عام طور پر عبادت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسے نماز وٗ روزہ وغیرہ۔ اور کچھ وہ چیزیں ہیں جو ایک دوسرے سے تعلقات معاشرت کی صورت میں وابستہ ہیں۔

ہماری عبادت۔اس کو اگر ہم غور کریں تو ایک عادت ہے لیکن عبودیت کی روح اس میں نہیں ہے۔ خدا بھلا کرے ماں باپ کا جنہوں نے ہمیں عادت ڈال دی اس لیے پابند ہیں ۔مگر خود غور کر کے اس کی اہمیت کا احساس کریں ایسا نہیں ہے۔

اور یہ آج کل کے موجودہ بچوں میں جو عام طور پر ان فرائض کے ادا کرنے سے بے توجہی پائی جاتی ہے اس کی ذمہ داری یقیناً ماں باپ پر عائد ہے۔ حقیقت احساس مذہب کی حیثیت سے زیادہ فرق

نہیں ہے ۔ان نوجوان بچوں میں اور ضعیف ماں باپ کے طرز عمل میں ۔مگر ان ضعیف ماں باپ کے ابوین نے عادت ڈال دی تھی اور خود ان ماں باپ نے اپنے بچوں کو عادت نہ ڈالی۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے اپنے فرائض کا احساس نہیں کیا اگر کیا ہوتا تو اپنے بچوں کو ان چیزوں کا پابند بنانے کی انتہائی کوشش کرتے ہم دیکھتے ہیں کہ خود ان کی تو ایک وقت کی نماز ناغہ نہیں ہوتی مگر صاحبزادوں سے جھوٹوں بھی نہیں کہتے کہ یہ کیا ہے ۔یہ بچے قابل الزام ہیں ۔مگر ان سے زیادہ ان کے والدین قابل الزام ہیں۔یعنی اپنی کوئی بات ہو اور ذرا بھی دیر ہوئی تو بگڑ جائیں گے۔ لیکن خدا کے فرض کی اہمیت نگاہ میں اتنی بھی نہیں ہے جتنی اپنے معمولی کاموں کی۔ یعنی کوئی اپنے بچہ سے پانی مانگے اور دیر کرے تو خفگی ہوگی لیکن فرائض آلٰہیہ کی بجاآوری میں اگر کوتاہی ہوئی تو کوئی توجہ نہیں ۔پھر خود اپنی نماز۔

میں سچ کہتا ہوں جس طرح کی ہوتی ہے اس کو ہر شخص خود ہی جانتا ہے ۔صحت اور چیز ہے اور قبولیت دوسری چیز ۔صحت کے معنی ہیں قانون کے الفاظ کے مطابق رسمی حیثیت سے عمل کو بجا لے آنا۔اس میں مثلاً رکوع، سجود ،قیام، قعود ہونا چاہیے ۔اگر ان شرائط کو پورا کر دیا تو میں کہوں گا کہ صحیح ہو گئی نماز ۔لیکن یہ کہ اس میں واقع رجوع قلب تھا یا نہیں ۔اس میں توجہ تھی یا نہیں۔ اس میں عمل کی اہمیت کا احساس تھا یا نہیں ۔

یہ چیزیں صحت عمل سے بالاتر ہیں اس کو کہا جاتا ہے قبولیت۔ ہمارا عمل شاید صحت کے درجہ پر پہنچ جاتا ہو ۔لیکن یہ کہ حقیقتاً رجوع قلب جو روح عبادت ہے وہ ہمارے عمل میں کہاں ۔اس لیے کہ

اس کی بنیاد تو اس پر ہے کہ جس کی عبادت ہو رہی ہے اس کا صحیح تصور ہو خداوند عالم کا اگر یقین کامل ہو تو اس کا لازمی نتیجہ ہو گا کہ عبادت بھی ویسی ہی ہو۔ اس لیے امیر المومنین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے "اعْبُدِ اللّٰہَ کَأَنَّکَ تَرَاهُ ۚ فَإِن لَمْ تَكُن تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ"۔ترجمہ:"خدا کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا اس کو دیکھ رہے ہو ۔اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں ضرور دیکھ رہا ہے"۔

اگر یہ چیز انسان کے پیش نظر ہوں تو حقیقتاً وہ عبادت ہو جس کی مثال آپ کے سامنے روایات میں پیش کی گئی ہے۔ کہ پیر سے تیر کھینچا جائے اور احساس نہ ہو ۔یہ نتیجہ ہے اس تصور کا کہ ہم کس کے سامنے کھڑے ہیں۔جتنا یہ تصور زیادہ ہو گا اتنا ہی عمل میں کمال پیدا ہو گا۔ ہمیں جس وقت کے وضو کے لیے پانی آتا ہے عام طور پر کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن وہ کہ جو حقیقت سے اس کی واقف تھے ادھر وضو کے لیے پانی سامنے آیا چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا کسی نے پوچھا تو جواب دیا کہ تم کو نہیں معلوم کہ کس کی بارگاہ میں حاضری کا وقت آ رہا ہے ۔

یہ اس کی عظمت کے احساس ہی کا نتیجہ ہے کہ چاہے انسان کتنا ہی نیکو کار ہو مگر اس کی بارگاہ میں اپنے تئیں ہمیشہ کوتاہ دست سمجھتا ہے۔ ہم اگر شب قدر میں بیدار رہیں کبھی عبادت زیادہ کی تو ناز ہے اس پر۔ سمجھتے ہیں کہ ہاں! ہم نے عبادت کی۔ لیکن وہ جو حقیقتاً عبادت کرنے والے تھے ہمیشہ اپنے تئیں قاصر سمجھتے تھے ۔اس لیے جب اس کی بارگاہ میں آئے تو گناہ کا اقرار ۔وہ تڑپ اور بیچینی جو حقیقی گناہ کے احساس میں ہوتی ہے۔ صحیفہ کاملہ میں امام زین العابدین کی دعاؤں کو ملاحظہ کیجئے ان

کے الفاظ کی نقل ہے جو نامعلوم کتنے واسطوں سے نکل کر ہم تک پہنچی ہے ۔لیکن اب تک ان کو پڑھ کر دل ہل جاتا ہے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔

امیر المومنین کا محراب عبادت کے اندر رات کی تاریکیوں میں وہ عالم جسے ضرار نے معاویہ کے دربار میں بیان کیا کہ۔"يَتَمَلَّهَلُ تَمَلَّهَلُ السَّلِيمُوَيَكْبِي بُكَاءً الثَّكْلَى زِيْقَوْلِ أَلَا مَنْ قَلَّتْهُ الزَادُ وَبَعْدَ السَفَر" ۔ ترجمہ:"مثل مرگزیدہ تڑپتے تھے اور مثل زن پسر مردہ روتے تھے اور کہتے تھے ہائے افسوس زا و راہ اتنا کم اور سفر اتنا طولانی" ۔یہ آپ سے جو کہا گیا ہے کہ صراط بال سے زیادہ باریک ہے۔ تو کیا مادی حیثیت سے یہ درحقیقت اس راہ کی دشواری کا اندازہ کرانا ہے مجسم الفاظ میں۔ کہ اس راستہ کو بالکل معمولی راستہ نہ سمجھو۔ بلکہ یہ اتنا دشوار گزار راستہ ہے ۔آپ کو کبھی اتفاق ہوا ہو کسی حاکم سے ملاقات کو جانے کا۔ بہرحال وہ بھی ایک آدمی ہے۔

مگر کسی حیثیت سے اس کی بزرگی دماغ میں راسخ ہو گئی ہے ۔تو رات بھر ایک الجھن رہے گی کہ کل کیا صورت پیش آتی ہے ۔اگرچہ آپ مجرم نہ ہوں ۔ملاقات کے طور پر اعزازی صورت سے آپ جانا چاہتے ہیں ۔لیکن جب تک کہ آپ ملاقات کر نہ لیں۔ اس وقت تک ایک خاص بیچینی رہے گی۔ اس لیے کہ آپ اس کی شخصیت کو دماغ میں جگہ دیے ہوئے ہیں۔

تو آپ یقین کر لیجئے کہ خدا کی عظمت کا جن کو صحیح احساس ہے۔ وہ اس کی کے رضامند رکھنے کے فرض کو اس طرح پر ادا کرتے ہیں جو اس کے شایان شان ہے۔ ان کو یہ احساس کبھی نہیں ہوتا تھا کہ عمل میں کتنی مشقت ہے ۔بلکہ وہ دیکھتے تھے کہ عمل اس کی شان کے لائق کیونکر ہو گا۔ اس کی

شان اتنی بڑی معلوم ہوتی تھی کہ اپنا عمل اس کی شان کے لائق نظر ہی نہ آتا تھا۔ اب رہا دوسرا شعبہ جو حقوق الناس سے متعلق ہے اس میں اگر خدا کے وجود کا صحیح تصور انسان کو ہو تو کیا ممکن ہے کہ کسی کے ساتھ زیادتی ہو جائے۔ درحقیقت عدالت ،مساوات انصاف، سب چیزیں مبنی ہیں اس پر کہ خدا کا عقیدہ ہو۔ لیکن اگر خدا کا اعتقاد زبان پر ہے اور اس کے ساتھ انسان دوسروں کے حقوق پر غاصبانہ تصرف کرتا ہے۔ دوسروں کے کسی جائز حق کو ادا نہیں کرتا تو ایسا انسان ہرگز خدا کو دل سے نہیں مانتا ہے۔

کیا یہ سب کچھ ممکن ہے اگر وہ یہ سمجھتا ہو کہ خدا حاضر و ناظر ہے؟ انسان کی خصلت ہے کہ جب کوئی جرم کرے گا تو لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہونے کی کوشش کرے گا۔ لیکن یہ کبھی احساس نہیں ہوتا کہ کوئی اور بھی دیکھنے والا ہے ۔اس کا قرآن مجید میں تذکرہ کیا گیا ہے۔" یَّسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ النَّاسِ وَ لَا یَسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ اللّٰہِ وَ ہُوَ مَعَہُمۡ" ۔ ترجمہ :"یہ لوگ (اپنی حرکتوں کو) لوگوں سے تو چھپا سکتے ہیں لیکن اللہ سے نہیں چھپا سکتے اور اللہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے"۔(سورہ النساء:108)۔

مشہور ہے کہ جس وقت یوسف معرض امتحان میں تھے وہ ایک سخت امتحان تھا نفس کا جہاں دنیا کے کمزور ارادہ والے ڈگمگا جائیں ۔وہ زلیخہ کا مکان اس کی چار دیواری اور اس کا قہر و جبر۔ اس وقت یوسف کی نظر پڑی دیکھا کہ ایک گوشہ میں پردہ پڑا ہوا ہے۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ کہا کہ یہ صنم ہے جس کی میں پرستش کرتی ہوں مجھے اچھا نامعلوم ہوا کہ اس پر پردہ نہ ہو ۔میں نے اس پر پردہ ڈال دیا۔ یوسف نے کہا کہ تمہارا معبود وہ ہوگا جو پردہ ڈالنے سے چھپ جائے۔ مگر میرا معبود تو ایسا ہے کہ ہزاروں پردوں سے بھی نہیں چھپتا۔ پھر میں اس کا خیال کیسے نہ کروں۔

تو انسان اگر حقیقی اعتقاد خدا کا رکھتا ہو تو یہ کیا کہ جس سے ذرا سا اندیشہ ہوتا ہے اس کی خلاف ورزی نہیں کی جاتی ۔مگر اس کی کوئی پرواہ نہیں تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ واقعی انسان خدا کو مان رہا ہے۔ ہم اس وقت تک بہت خدا پرستی کا دعویٰ کرتے ہیں جب تک ہماری کسی غرض سے تصادم نہیں ہوتا اور ادھر کوئی غرض و دنیاوی ہمارے سامنے آئی۔

چاہے وہ ایک معمولی سا فائدہ کیوں نہ ہو۔ادھر ہم فرض کے احساس کو بھول گئے ۔ہمیں پھر خبر نہیں ہوتی کہ ہمیں کرنا کیا چاہیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم منافع کو بہت سمجھتے ہیں اور جو اس کے مخالف طاقت ہے اس کو کچھ نہیں سمجھتے۔ہم کہتے ہیں" اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ بار الٰہا" ۔ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ (سورہ الفاتحہ:05) ۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیاوی طاقت سے زیادہ بھروسہ ہے اس کی طاقت پر۔ مگر ہمارا عمل بتلاتا ہے کہ ذرا سی بات پڑ جاتی ہے تو دنیا کے ولی نعمت اشخاص کو ہم اس طرح قبلہ حاجات سمجھ لیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا رزق صرف انہی سے وابستہ ہے۔ اگر یہ ہاتھ کھینچ لیں تو ہمارا دینے والا کوئی نہیں ہے ۔اور وہ کہ جو ذرا سی پرورش کرتے ہیں وہ بھی سمجھتے ہیں کہ اب اس غریب کو ہماری بندگی اختیار کرنا چاہیے ہر بات میں چاہتے ہیں کہ پابند رہے۔

چاہے ہمارا طرز عمل صحیح ہو یا نہیں معلوم ہوتا ہے کہ نہ اس دینے والے کے دل میں ہے کہ ہمارے سوا کوئی ہے ۔نہ لینے والے کے دل میں ہے کہ اس کے سوا کوئی اور بھی ہے۔ یہ کیا ہے کہ ذرا سی ہم کو بھلائی حاصل ہوئی ۔ہم سفید پوش ہوئے۔ اور ایک غریب میلے کپڑے پہنے ہوئے آگیا تو

یہ بات ہم کو ناگوار معلوم ہوئی کہ ہمارے پاس بیٹھے ۔صدر محفل میں آگیا تو دھکا دے کر اٹھا دیا کہ یہ تیری جگہ نہیں ہے۔ یہ جگہ کس نے مقرر کی؟ یہ نتیجہ اس کا ہے کہ آپ کو اس خالق کا احساس نہیں ہے جس کے آپ سب بندے ہیں۔ یہ تو سب باتیں ہمارے دماغ میں وہی پیدا ہو گئی جن کی بیخ کنی ہمارے مذہب نے کی تھی۔

ہمارے اسلام نے جن چیزوں کو دنیا سے اٹھا دیا تھا اسی کے ہم پابند بن گئے۔ ہندوستان میں جہاں یہ چیزیں پہلے سے رائج تھیں ہمارے یہاں بھی پیشوں کے اعتبار سے چھوت چھات پیدا ہو گئی ۔طرز معاش میں ہمارے تفریق قائم ہو گئی ۔ایک مہتر چاہیے کتنا ہی وہ نہا دھو کر صاف کپڑے پہن کر آئے غیر ممکن ہے کہ ہم اس کو اپنے پاس بیٹھنے کے لیے جگہ دے سکیں ۔یا ایک گلاس میں پانی پی سکیں۔ ہماری تیوریوں پر بل آ جائیں گے۔ ہم سمجھیں گے کہ ہماری شان گھٹ گئی۔

یہ ہم کو اپنی شان کا احساس اور اس کی شان کی پستی کس لیے نظر آئی چونکہ اس کا پیشہ ایک ذلیل پیشہ ہے اس لیے ذات بھی ذلیل ہو گئی حالانکہ وہ بھی اسی کا مخلوق ہے جس نے ہم کو پیدا کیا ہے۔ اس کا ذکر کیا ہے ایک وہ شخص جو ہمارا خدمتگار ہو گیا ہے جس کو ہم نے چھ روپے ،سات روپے ،آٹھ روپے ، دس روپے،پر ملازم رکھ لیا ہے اس کے ہم روادار نہیں ہیں کہ ہمارے پہلو میں بیٹھ جائے حالانکہ اگر ہم غور کریں تو وہ ہمارے ساتھ ایک برابر کی حیثیت رکھتا ہے۔

یعنی ہمارا اجیر ہے۔ہمارا ایک کام اس کے ذمہ ہے۔ اس کا روپیہ ہمارے ذمہ ہے۔ وہ ہمارا قرضدار کام کا۔ ہم اس کے قرضدار مال کے۔ تو تفوق اس میں کہاں سے ہو گیا ۔وہ کام کرتا ہے ۔اپنی محنت

کا لیتا ہے۔ پھر اگر ملازمت کی حیثیت سے دیکھیں تو ایک ہزار روپیہ پانے والا پروفیسر بحیثیت پابندی کے اس میں اور اس میں کیا فرق ہے ۔یہ بھی نوکر وہ بھی نوکر ۔اس کے ذمہ بھی ایک کام ہے اس کو انجام دے کر مزد کا مستحق ہوتا ہے۔ اس کے ذمہ بھی ایک کام ہے مگر ہم اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ہماری نظر ان چیزوں کی حقیقت پر نہیں جاتی۔ یہ تفریقیں اس لیے قائم کی گئی کہ ہمیں صحیح احساس نہیں ہے اس واحد قوت کا جو ہم سب پر یکساں بلندی رکھتی ہے۔

تعمیر انسانیت میں میں نے تفصیل سے بیان کیا تھا کہ توحید خدا کا اتنا احساس اور اتنا زور اس پر ۔اور اس میں تعمیم اس لیے پیدا کی گئی تھی کہ تم تمام عالم انسانیت میں ایک متحد رشتہ کا احساس کرو ۔وہ دوسرے مثلاً نصاری تھے جن کی انجیل میں خدا کو بنی اسرائیل کا خدا کہا گیا ہے ۔جہاں بھی اس سے تعبیر کی گئی ہے بنی اسرائیل کا خدا کہا گیا ہے۔ کہیں ہمارا باپ کہا گیا ہے ۔قرآن مجید نے ان کی ترجمانی کی ہے کہ وہ کہتے ہیں۔" نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ"۔ ترجمہ : "ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں" ۔ (سورہ المائدہ:18)۔

اس کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان یہ کہتے کہ ہمارا خدا اور ہم اس کے محبوب ۔لیکن یہ نہیں کہا گیا بلکہ یہ کہا گیا ۔" رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۚ وَ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُم" ۔ ترجمہ :"ہمارا اور تمہارا رب وہی ہے اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال"۔(سورہ البقرۃ:138)۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہم سب کو ایک نگاہ سے دیکھتے ۔مگر ایسا نہیں ہوتا ۔اگر ہم سے کوئی غلطی ہو جائے ۔کسی بڑے آدمی کے لحاظ سے تب تو ہم شاید معافی مانگنے کو تیار ہو جائیں گے لیکن اگر کسی وقت ہم سے کوئی بے

انصافی ہو گئی کسی پست انسان کے لیے ۔جس کو ہم نے پست قرار دے لیا ہے تو چاہے ہم بعد کو سمجھ بھی لیں ہم نے برا کیا ہے ۔ہم نے غلطی کی۔ لیکن یہ ہماری شان خود داری کے خلاف ہو گا ۔کہ ہم اس غلطی کا اقرار کریں بلکہ ہم اسی کو منوانے کی کوشش کریں گے کہ وہی غلطی پر تھا۔ ہم کہیں گے کہ مصلحت کا تقاضا یہی ہے یہ کس لیے ۔

میں سچ کہتا ہوں کہ یہ بڑا امر عظیم ہے ۔انسانوں کی آپس کے حقوق جو ایک دوسرے پر ہیں یعنی ایک وقت کی نماز نہایت عظیم۔ یہاں تک کہ ترک کرنے کو کہاں گیا کہ کفر کے قریب مگر ایک حیثیت سے وہ آسان اور اگر ایک پیسہ کسی کا غلط طریقہ پر ہماری جانب آ گیا یا ایک ذرا سی بات جس کی وجہ سے ہماری طرف سے کسی کو شکایت پیدا ہو گئی اور کسی کا دل ٹوٹ گیا ۔یہ انتہا سے زیادہ بڑی چیز ہے۔ اس کو خداوند عالم نے حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا ہے کہ" لَا يَسَعُنِي أَرْضِي وَلَا سَمَائِي، وَلَكِن يَسَعُنِي قَلْبُ عَبْدِي الْمُؤْمِن"۔ ترجمہ: " میری سمائی آسمان و زمین میں نہیں ہے۔ لیکن اپنے مومن بندے کے دل میں میری سمائی ہے"۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ڈرو کسی کے دل کو آزار پہنچانے سے اس لیے کہ دل میں خدا کی منزل ہے وہ ایک مخلوق کی دل آزاری سے اپنی تکلیف سمجھتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے جو یہ بتلایا گیا کہ خدا اپنے گناہ جو براہ راست اس کے متعلق ہیں معاف بھی کر دیتا ہے مگر جو ایک دوسرے کے آپس کے گناہ ہیں وہ معاف نہیں کرتا جب تک خود جس کا جرم ہے معاف نہ کرے۔ اب یہ کتنا مشکل مرحلہ ہو گیا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ کسی کریم سے سابقہ پڑنا آسان ہے ۔اور اپنے ایسے تنگ ظرفوں سے سابقہ پڑنا دشوار ہے۔ وہ وہی ہے جو مغفرت کے لیے بہانہ ڈھونڈتا ہے اور ہم وہ ہیں کہ جو انتقام کے لیے

بہانے تلاش کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی دل آزاری کرنا اور تکلیف پہنچانا بڑا گناہ ہے۔ لیکن ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا ہم ممکن ہے کہ اپنے کو بڑا زاہد سمجھتے ہوں۔ محراب عبادت میں نماز شب پڑھتے ہوں۔ ہر وقت زبان پر ذکر الہیٰ جاری رکھتے ہوں۔ اور خدا کی عبادت بہت زیادہ کرتے ہوں۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ کتنے دلوں کو ہم نے رنجیدہ کیا۔

کتنے لوگوں کو تکلیف پہنچائی۔ کتنوں کو نقصان پہنچایا۔ کتنے حقوق تلف کیے ۔اس کا کبھی احساس نہیں ہوتا ۔گویا یہ چیز عبادت کے مفہوم سے خارج ہے۔ حالانکہ آپ ملاحظہ فرمایئے قرآن مجید میں آپس کے حقوق اور تعلقات کے درست رکھنے کے لیے اتنے واضح بیانات اتنی تاکیدیں کی گئی ہیں جتنے کسی اور چیز کے لیے نہیں کی گئی۔ دنیا میں آپس میں معاشرت کے درست کرنے کے لیے آپس کے تعلقات بڑھانے کے لیے ایک کے پس پشت دوسرے کی برائیاں کرنا دوسرے کے عیوب تلاش کرنا دوسروں کی نکتہ چینی کرنا ۔دوسروں کی دل آزاری کرنا ۔

ان تمام باتوں کو انتہائی ممنوع قرار دیا گیا۔ اذیت دینا کسی ایک مومن کے نفس کو مستحق بناتا ہے لعنت کا خدا کی بارگاہ میں۔ یہ تعلقات قائم کیے گئے تھے تمام لوگوں کے درمیان میں کہ ہر ایک دوسرے کا احترام کرے عزت کرے۔جس طرح انسان کو خود یہ پسند نہیں کہ اس کے عیوب نمایاں ہوں اس طرح اس کو یہ کیا حق ہے کہ وہ دوسروں کے راز فاش کرے۔

دنیا میں منافرت اور تصادم یہ چیزیں جو پیدا ہوتی ہیں اس کی تین منزلیں ہیں۔ پہلی منزل ہے بدگمانی کا پیدا ہونا۔ دوسری منزل یہ ہے کہ بدگمانی کے بعد جستجو ہو نقائص اور عیوب کی ۔تیسری منزل یہ

ہے کہ ان عیوب کا تذکرہ ہونے لگے ۔اگر ان میں سے ہر چیز اپنی جگہ پر ختم ہو جائے تو کبھی فساد نہ برپا ہو۔ قرآن مجید نے ہر منزل پر پہرے مقرر کیے ۔سب سے پہلے یہ کہا۔" اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۟ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ " ۔ ترجمہ : "دیکھو زیادہ گمان پر عمل نہ کرو بہت سے گمان ایسے ہوتے ہیں کہ بالکل گناہ ہوتے ہیں"۔(سورہ الحجرات: 12)۔

حدیث میں آیا ہے ۔" ظَنُّوا بِالْمُؤْمِنِينَ خَيْرًا"۔ ترجمہ : " آپس میں ایک دوسرے پر اچھا گمان رکھو"۔ یہ کہا گیا کہ اگر ننانوے پہلو کسی بات میں برائی کے ہوں اور ایک پہلو بھی اچھائی کا ہو تو ہمیشہ اس کے عمل کو اس اچھائی کی طرف محمول کرو ۔اس کے بعد اگر بدگمانی پیدا ہو جائے تو پھر ارشاد ہوا "لَا تَجَسَّسُوْا" ۔ترجمہ :"ایک دوسرے کے عیوب کی جستجو نہ کرو فکر میں نہ پڑو"۔(سورہ الحجرات: 12)۔ہمارا یہ طریقہ کہ اگر ذرا بھنک مل گئی کسی کے عیب کی تو ایک دوسرے سے دریافت کر رہے ہیں ۔تیسری منزل یہ ہے۔

" وَ لَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ" ۔ ترجمہ: "اور تم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ اس سے تو تم نفرت کرتے ہو"۔ (سورہ الحجرات: 12)۔

تم سب اس کو میری نظر سے دیکھو گے اس کا مطلب یہ ہے کہ مردہ قوت مدافعت نہیں رکھتا اسی طرح جو سامنے نہیں ہے وہ غیبت کی وجہ سے صفائی نہیں دے سکتا ۔اس لیے آپ جو اس کے پیٹھ پیچھے برائی کر رہے ہیں یہ ویسا ہے جیسے مردہ بھائی کا گوشت کھایا جائے۔ مگر ہماری دلچسپی کا ذریعہ ہے

اور دل آویزی کا سبب ہے ایک دوسرے کے عیوب کا بیان کرنا ۔ان پر تبصرہ کرنا یہ ہمارا دلچسپ مشغلہ ہے ۔ہم سے جو کچھ کہا گیا تھا اس کے خلاف کرتے ہیں۔ اور پھر اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔بعد کی منزلیں تو بہت دور ہیں۔

امت رسول اس بات پر نازاں ہے کہ ہم امت مرحومہ ہیں۔ نجات کے ضرور مستحق ہیں۔ اس کے بعد امت مرحومہ میں بھی ہماری جماعت کیوں کے بہتر فرقے ہیں ہر ایک خیال کرتا ہے کہ ہم حاجی ہیں۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے ۔" سَتَفْتَرِقُ أُمَّتِي عَلَى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ فِرْقَةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَة" ترجمہ۔ "میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، ان سب میں سے ایک فرقہ کے سوا باقی سب جہنم میں جائیں گے"۔ مگر ان سب کی بنیاد ہے ایمان نجدہ اگر ہمارے اعمال و افعال یہ نمائش کر رہے ہیں کہ ہم خدا ہی کو کچھ نہیں سمجھتے تو اس کے بعد نجات کیسی ۔

اہل بیت رسول کی طرف رشتہ داری کیسی۔ کیونکہ سب رشتہ تو خدا ہی پر منتہی ہوتے ہیں۔ ان رشتوں میں جو عظمت پیدا ہوتی ہے وہ خدا ہی کے لحاظ سے ۔اگر اس کو نکال دیا جائے تو رسول میں بحیثیت ایک مادی انسان کے کیا عظمت تھی ۔صرف خدا کی وجہ سے ان میں عظمت پیدا ہوئی۔ ورنہ ظاہری عظمت کے ذرائع تو ایسے تھے کہ جنہیں دنیا نے سلب کر لیا تھا۔ جاہ و دولت شان و شوکت سے اہل بیت رسول اور خود رسول الگ تھے ۔

اس حیثیت سے تو قیصر و کسری میں عظمت تھی۔ پھر ان کو جو عظمت پیدا ہوئی تو وہ خدا ہی کی وجہ سے ۔یعنی خدا کے یہ کامل بندے تھے ۔اس لیے قابل عظمت ہیں۔ خدا کی صحیح تعلیم کے مروج تھے

اس لیے ان کی عظمت ہے مگر جب ہمارے دل میں خدا ہی کی عظمت نہیں ہے تو پھر اس کی طرف نسبت رکھنے والوں کی کیا عظمت ہو سکتی ہے۔ اب اگر خدا کی عظمت کا صحیح احساس ہے تو اس کے کیا معنی کہ خدا کی عبادت میں کوتاہی۔ اس پر یہ غرہ کے ہم نجات ضرور پائیں گے ۔خدا کی عبادت پر مضحکہ ۔یہ چیز اس وقت بہت شائع ہے خصوصاً جو نئی عمر کے لوگ ہیں ان میں یہ بہت کافی موجود ہے کہ اگر فرائض کا خدا کے ذکر ہو تو ان کی زبان سے کوئی تمسخر کا لفظ نکل جائے لیکن اس کے بعد وہ کہیں گے کہ ہم خدا کا اعتقاد رکھتے ہیں ۔

یہ جو کچھ کہا جا رہا تھا مذاق ہی تھا مگر یاد رہے کہ جب ذہن میں کسی کی عظمت کا احساس ہو تو زبان سے تمسخر کی کوئی بات اس کی نسبت نکل ہی نہیں سکتی۔ یہ ظرافت خود ترجمانی کرتی ہے کہ ذہن میں اس کی عظمت کا کوئی اثر نہیں ہے ۔ہمارے افعال جب ان باتوں کو دکھلاتے ہوں تو پھر ہم یہ کہیں کہ ہمارا کسی کے ساتھ منسوب ہو جانا بس یہ ہمارے لیے نجات کا پروانہ ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ پانی کے نام سے پیاس نہیں بجھتی ۔غذا کے خیال سے بھوک نہیں دور ہوتی لباس کا تصور جسم نہیں ڈھانکتا۔ اگر ہر چیز میں حقیقت کا ہونا ضروری ہے ۔

جو جو چیزیں آپ نے معیار نجات قرار دے لی ہیں ان کا نام نہ بخشوائے گا۔ان کی حقیقت بخشوائے گی ۔الفاظ پر اثر نہیں مرتب ہوتا اگر نام ہے اور اس کے ساتھ پھر احترام نہیں ہے تو نام ہونا نہ ہونے سے بدتر ہے جیسا میں کہہ رہا تھا کہ جو لوگ مادیین ہیں۔خدا کو نہیں مانتے وہ تو مانتے ہی نہیں۔ مگر جو مانتے ہیں اور مانتے ہوئے اس کا احترام نہیں کرتے تو ان کا طرز عمل بہت زیادہ قابل گرفت ہے ۔وہ عملی طور پر اس کی عزت کا خیال نہیں کرتے۔ یوں ہی جو لوگ رسول اللہ کی طرف اپنے کو

منسوب ہی نہیں کرتے وہ اتنا قابل الزام نہیں ہے جتنا اتنی بڑی ہستی کی طرف منسوب ہونے کے بعد مثال کے طور پر ایک کالج ہے جس میں بہت سے درجوں کے پڑھنے والے ہیں ۔نیچے درجے کا پڑھنے والا اگر کوئی غلطی کر دے تو اتنا قابل الزام نہیں ہے جتنا بڑے درجہ والا اسی سوال کو نہ حل کر سکے غلطی کرے تو قابل الزام ہو گا ۔اس کا بڑا ہونا اس کی کو سبکدوش نہ کرے گا بلکہ ذمہ داری میں اضافہ کر دے گا۔

یوں ہی سمجھ لیجئے کہ خدا کی شریعت اور تعلیمات کا ایک مدرسہ ہے جس کے پہلے معلم حضرت آدم تھے ۔اس کے بعد نصاب تعلیم بڑھتا گیا !ابراہیم اور نوح معبوث ہوئے اور پھر حضرت موسیٰ کا درجہ آیا جتنے اس درجہ میں شریک ہونے والے تھے سب کو کچھ تعلیمات حاصل ہوئے ۔اس کے بعد آیا حضرت عیسیٰ کی تعلیم کا درجہ ۔یہ وہ لوگ ہیں جو موسیٰ کو بھی مانتے ہیں اور اس کے ماورا عیسیٰ کی بھی تعلیم حاصل کرنے کہ مدعی ہیں۔ نصاب تعلیم بڑھ گیا ۔اس لیے موسیٰ کے ماننے والوں سے زیادہ عمل کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے ۔

کیونکہ ان کے پاس تو صرف موسیٰ کی تعلیمات پہنچی۔ عیسیٰ کے ماننے والے وہ ہیں جن کے پاس ان سے زیادہ تعلیمات پہنچیں۔ اب جس وقت کے عیسیٰ کے بعد عالم انسانیت کا درجہ بلند ہوا اور وہ معلم انسانیت آیا جس کی تعلیم آخری درجہ رکھتی ہے۔ اس درجہ میں جو آنے والے ہیں ان کو کسی دنیا والے کے مذہب پر اعتراض کی ضرورت نہیں مسلمانوں کو حق نہیں کہ وہ موسائیوں ،عیسائیوں کے افعال کی گرفت کریں لیکن ان کے افعال سب کے لیے گرفت کے قابل ہیں کیونکہ یہ مدعی ہیں اس بات کے کہ اس نبی کو مانتے ہیں جو سب سے بہتر تھا تو ان کو اپنے عمل سے ثابت کرنا چاہیے کہ اس

کی تعلیم سے انہوں نے کیا نتیجہ حاصل کیا۔اس کے بعد رسول دنیا سے اٹھ گئے اختلافی مسائل مخفی بیان کرنا نہیں ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ بعض لوگوں نے عصمت کو وہیں تک ختم کر دیا۔

اور یہ خیال قائم کیا کہ رسول کے بعد کوئی معصوم تعلیم دینے والا نہیں ہے تو ان پر کتنی تعلیم پر عمل کرنے کی ذمہ داری ہے صرف اتنی ہی جو رسول سے وحی کے ذریعے سے پہنچی۔ اس زمانہ میں جتنی تعلیم پہنچی ہے ۔بس اتنی تعلیم پر عمل کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ۔لیکن اس کے بعد کچھ لوگ وہ تھے جنہوں نے کہا کہ نہیں اب بھی ہمارے پاس معصوم ہستیاں موجود ہیں ہماری تعلیم کے لیے اور وہ دین الٰہی کے حافظ ہیں ۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اسے فرض نہیں کیا کہ نصاب تعلیم ختم ہو گیا بلکہ اس کے بعد بھی تعلیم جاری رہی یہ درجہ آگے بڑھتا رہا۔ کچھ لوگوں نے چھٹے درجہ سے ساتھ چھوڑا کچھ نے سات سے اور کچھ نے آٹھ سے ساتھ چھوڑا ۔لیکن اثنا عشری جماعت وہ ہے جو پوری تعلیم کو حاصل کرنے کی مدعی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنے عمل سے تمام دنیا کے لیے نمونہ قائم کیجئے۔

آپ کو دکھلانا چاہیے کہ سب سے زیادہ ہمارے اعمال قابل تائید ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کو کسی پر اعتراض کا حق نہیں مگر دنیا کو ہمارے افعال کی جانچ کا حق ہی نہیں معنی تھے اس کے کہ" نوَّنَا زِینا وَلَا تَکُونَنَّ عَلَینَا شِیعا "۔ترجمہ : "تم ہمارے لیے رونق کا سبب بننا کہ دنیا تمہارے افعال کو دیکھ کر کہے کہ یہ ہمارے شیعہ ہیں"۔ہمارے لیے دامن کا دھبہ نہ بننا کہ تمہارے افعال سے ہم پر انگشت نمائی کی جائے۔ ہم اس ناز میں ہیں کہ ہم اتنے اتنے بڑے درجہ کے تعلیم یافتہ ہیں مگر ہم

نے ان تمام علوم کو بھلا دیا جو ہم کو پڑھائے گئے تھے ۔میں سچ کہتا ہوں کہ یہ معلمین ہم سے ناراض ہوں گے ہم کو اس رشتہ اور اس نسبت سے کہ ہم ان کے درجہ کے تعلیم یافتہ ہیں کوئی فائدہ نہ ہو گا بلکہ نقصان کا باعث ہو گا ۔ہم کو بے شک انتہائی شرف حاصل ہے اگر اس حق کا ہم لحاظ بھی کریں اور اس درجہ کی لاج بھی رکھیں پھر ایک دوسری حیثیت سے یہ ملاحظہ کیجئے کہ آپ کو اپنے عمل کی سب سے زیادہ نگرانی کی ضرورت ہے۔ یہ امتحان میں نگراں کس غرض سے ہوتے ہیں ۔

اس لیے کہ لڑکے آپس میں کاپیاں نقل نہ کریں اگر یہ نگراں نکل جائیں درجہ سے تو ہنگامہ برپا ہو جائے کوئی نظام ہی نہ قائم رہے ۔دنیا والے جو قابل ہیں کہ قائل ہیں اس وقت کوئی نگراں ہی نہیں ہے وہ اگر متعلق العنان ہوں تو ہوں مگر جب آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارا ایک نگراں موجود ہے پردہ غیبت میں تو ہم کو بہت زیادہ اپنے افعال کے آراستہ رکھنے کی ضرورت ہے۔

ہم کو دوسروں سے کیا مطلب ہم کو تو اپنے افعال کو بنانا چاہیے دیکھنا چاہیے کہ ہم کو کیا ہونا چاہیے اور ہمارے افعال و اعمال کیسے ہونا چاہیے۔ ہمارے آئمہ نے خود یہ اعلان کر دیا ہے کہ" مَنْ أَطَاعَ اللَّهَ فَهُوَ لَنَا مُحِبٌّ وَمَنْ عَصَى اللَّهَ فَهُوَ لَنَا عَدُوٌّ"۔

ترجمہ:"جو اللہ کی اطاعت کرتا ہے وہ ہمارا دوست ہے اور جو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے"۔ اس وقت بھی آپ کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہا گیا ہے کہ ہر شب جمعہ تمہارا نامہ اعمال تمہارے امام کے سامنے پیش ہوتا ہے اگر امام اچھا عمل دیکھتے ہیں تو چہرہ پر بحالی آجاتی ہے اور اگر برا عمل دیکھتے ہیں تو آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ لہذا ہم کو اپنے افعال و اعمال کی اصلاح لازم ہے اس صورت میں یہ صحیح ہو گا کہ ہم خدا کو مانتے ہیں۔رسول کو مانتے ہیں اور آئمہ کو مانتے ہیں لیکن اگر اس میں

ہم نے کوتاہی کی اور توجہ نہیں کی اور ہم نے اس کی بالکل اہمیت کا احساس نہ کیا تو میں سچ کہتا ہوں کہ چاہے ہم زبان سے سب کو ماننے کا اظہار کرتے رہیں لیکن ہمارا عمل بتلائے گا کہ دل سے ہم کسی کو بھی نہیں مانتے۔

☆☆☆☆☆